نظریے کا فرق بھی واضح کیا گیا ہے، شروع میں گاندھی جی کے حالات و سوانح اور قومی و سیاسی جد و جہد کا مختصر خاکہ بھی درج ہے۔

نغمۂ شب۔ از جناب اختر بستوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۹۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ۔ پتہ: شب خوں کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد ۳۔

جناب اختر بستوی ایک نوجوان شاعر ہیں، زیر نظر مجموعہ انکی ایک طویل موثر نظم ہے، اس میں انھوں نے رات کے سناٹے میں اس سے اپنے ہمکلام ہو کر اس کے نغمے سننے کا ذکر کیا ہے، اسکے تین حصوں میں زندگی کے صدمات اور تلخیوں، موت کی بے رحمی اور موجودہ حالات کی داستان، زندگی کے کرب و بے چینی اور سماج کی ناہمواریوں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے، بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین یہ نظم اقبال کی "خضر راہ" کی یاد دلاتی ہے، مگر اختر صاحب ابھی نوجوان ہیں، انکو شاعرانہ لطافت و رنگینی، تخیل کی بلندی، سلاست و روانی اور طرز ادا کی دلکشی وغیرہ کی جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کلام میں مزید پختگی اور نکھار پیدا ہو۔

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین
نام پبلشر	"
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین۔ اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین۔ اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" " " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

جلد ۱۱۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق مارچ ۱۹۷۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبد الرحمن	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبد الرحمن	۱۶۵-۱۸۸
شرح السنۃ امام بغوی	ضیاء الدین اصلاحی	۱۸۹-۲۰۱
جامع مسجد برہانپور کے کتبات (فتح اسیر گڈھ کا کتبہ)	جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی سیوا السدن کالج برہانپور	۲۰۲-۲۱۲
ڈاکٹر سید محمود کا مقدمۂ دیوان غالب نظامی اڈیشن	جناب بشر علی صدیقی ایم اے علیگ بدایوں	۲۱۳-۲۱۹

وفیات

جناب مولانا ظفر احمد عثمانی رح	"ض"	۲۲۰-۲۲۱
جناب حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم	"ص۔ع"	۲۲۲
تعزیتی خطوط		۲۲۳-۲۳۶
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۲۳۷-۴۰

تصحیح

معارف ماہ فروری ۷۵ء کے مضمون ہندوستان کی مذہبی رواداری میں ص ۹۰ سطر ۱۹ میں لفظ "شودر" غلط چھپ گیا ہے، صحیح سوار ہے۔

"ص،ع"

شذرات

دارالمصنفین کے مہمان خانہ میں لکھنؤ کے رہنے والے ایک مسلمان سرکاری عہدیدار ٹھہرے تو انھوں نے اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ اُن کا لڑکا اچھی غزل کہتا ہے مگر اُس کو ہندی رسم الخط میں قلمبند کرتا ہے کیونکہ وہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا :- ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک مشہور درسگاہ کے ایک استاد نے بتایا کہ وہاں کے کافی طلبہ درود شریف اور تشہد کو ہندی میں لکھ کر یاد کرتے ہیں، یو. پی کے بہت سے والدین کی زبانی سننے میں آتا ہے کہ اُن کی لڑکیاں بھی ہندی ہی میں خط و کتابت کرنے لگی ہیں، یو. پی ہی کے ایک وکیل صاحب کہنے لگے کہ اُردو میں لکھا ہوا کوئی خط گاؤں پہنچ جاتا ہے تو گھر والے اس کو رکھے رہتا ہے کہ کوئی اردو داں کہیں ملے تو اُس سے پڑھایا جائے،

اگر کوئی قوم یا فرقہ یا نسل اپنی مادری زبان کھو بیٹھتی ہے تو وہ جیتے جی ہلاک ہو جاتی ہے، اردو بولنے والے طلبہ کے لئے اپنی مادری زبان نہ پڑھنا اور اُس کے پڑھانے کی سہولتیں فراہم نہ کرنا نسل کشی ہے، طلبہ اردو اس لئے نہیں پڑھتے کہ سرکاری ملازمتوں میں یہ کام نہیں آتی اگر زندگی کا مقصد صرف پیٹ پالنا ہو تو مادری زبان چھوڑی جا سکتی ہے پھر اسی پیٹ کی خاطر دین بھی چھوڑنے میں تامل نہ ہوگا جس کے بعد تہذیبی اور مذہبی روایات کا وارث بن کر زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا، "اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"

یوپی میں عام شکایت یہ ہے کہ درسگاہوں میں اردو پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام نہیں، اسی لئے طلبہ اردو پڑھ نہیں پاتے ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد اس ریاست میں اردو پر جو آفت آئی اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں، گذشتہ ۲۸ برسوں میں اس کو نیم جاں کر دیا گیا، اور جب یہ جاں بلب ہونے لگی تو اس کی تعلیم کی سہولتوں کا اعلان کیا گیا، مگر اردو کی زبان پر اس رحمت کے پیامبر سے یہ فریاد ہے،

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں ہے،

مرکزی حکومت اور اترپردیش کے موجودہ فراخدل اور اردو داں وزیر اعلیٰ تو اردو کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں مگر حکومت اور عہدیدار خصوصاً دفتری ملازمین اپنے دلوں کو ٹٹول کر خود فیصلہ کریں کہ وہ اس اعلان کی خانہ پری اردو بولنے والوں کا محض منھ بند کرنے یا واقعی اس زبان کو اپنے سنگھاسن پر بٹھانے کی خاطر کرتے ہیں، کچھ دن ہوئے ملک کے ایک مشہور رہنما جو حکومت ہند کا اعلیٰ ترین عہدہ پانے کی بھی تمنا رکھتے ہیں دارالمصنفین تشریف لائے، یہاں کے علمی کاموں کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سارا کام اردو کے بجائے ہندی میں ہوتا تو زیادہ مفید ہوتا کیونکہ آئندہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد ہی کتنی رہ جائیگی، اس سے ہندی کے حامیوں کے اندرونی جذبات اور اصلی خواہشات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ع : تقدیر کو تدبیر کے شاطر نے کیا مات،

اگر کوئی لسانی اقلیت اپنی زبان کو محفوظ رکھنے کا عزم بالجزم نہیں رکھتی تو حکومت کی چوکھٹ کی دریوزہ گری سے زندہ نہیں رکھی جا سکتی، وہ گل نغمہ یا پردۂ ساز اپنے بل بوتے ہی پر بن سکتی ہے، ورنہ اس کو اپنی شکست کی آواز بن کر رہنا پڑیگا، ہر ملک کی اکثریت اقلیت سے اپنی ہر چیز کو تسلیم کرانے کے حق کو استعمال کرنے میں گریز نہیں کرتی، یہ اس کا فطری تقاضا ہوتا ہے اس کیلئے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر جارحانہ رنگ بھی اختیار کرتی رہتی ہے مگر اقلیت کا بھی یہ فطری حق ہو کہ وہ اپنی ہر چیز کو برقرار رکھنے کے لئے پوری مدافعت کرے جو مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتی رہتی ہے اس جارحیت اور مدافعت کے ٹکراؤ میں اگر مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے تو جارحیت غالب آ جاتی ہے اور اگر مدافعت کی قوت بڑھتی جاتی ہے تو جارحیت کو مدافعت کے سامنے جھکنا پڑتا ہی جھکنے اور جھکانے کا کھیل ہر زمانے میں رہا کیا ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ اردو ہندی کے سامنے جھک کر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے یا اپنی فطری قوت نمو سے باقی رہتی ہے، اس کے حامیوں کو حکومت پر نکتہ چینی اور الزام تراشی کرنیکے بجائے اپنی کوتاہ اندیشی، سہل پسندی، حیلہ جوئی اور بے عملی کا بھی جائزہ لینا ہے، شکست خوردگی اور گریز پائی کی ریت کے اندر سر چھپا کر آندھی کے گزر جانے کا انتظار کرنا زندگی کی حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے اس سے منھ موڑنا ہے، زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے، ع : اٹھو و گرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی،

مگر خود اردو والے اپنے سے زیادہ مایوس نہیں ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک ہندوستان میں اردو میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ہندی کے علاوہ کسی اور علاقائی زبان میں شاید ہی ہوئی ہوں، مہاراشٹر، بہار، آندھرا اور

کر ہلک میں اردو بولنے والے طلبہ اسی زبان میں ثانوی تعلیم پارہے ہیں، تیج، ملاپ، پرتاب اور شیر پنجاب وغیرہ جیسے اخبارات کی اشاعت سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ ابھی تک غیر مسلموں میں بھی مقبول ہے، پاکستان میں اردو اخبارات کی تعداد و اشاعت وہاں کے انگریزی اخباروں سے زیادہ ہے، اب تو لندن سے بھی ایک اردو اخبار شائع ہونے لگا ہے، دنیا کے تمام اہم ملکوں کے ریڈیو اسٹیشنوں سے اردو کے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے بھی کھولے گئے ہیں، بیرونی ممالک میں اس کی قدر و منزلت اتر پردیش کے ان اردو بولنے والوں کے لئے باعث عبرت و غیرت ہے جو غزل کو اردو رسم الخط میں نہیں لکھ پاتے، دکھ اس کا بھی ہے کہ غزل اب گھائل ہو رہی ہے، اس کا عاشق آسک اور معشوق ماسوک ہو رہا ہے، عاشق کا سوز دل سوز دل، اور معشوق کا ظلم جولم، اور اس کی زلف جلیبھ بنتی جارہی ہے، یہ انقلاب، انیس، دبیر، ناسخ، آتش، نسیم، سرشار، چکبست اور شبلی کی سرزمین میں آرہا ہے ع :-   محمل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلا بھی گئی

گذشتہ مہینہ میں ڈاکٹر اعجاز حسین سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے مظفر پور میں ہو گیا، جہاں وہ ممتحن بن کر گئے ہوئے تھے، ان کی میت الہ آباد لائی گئی، اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری رکھا تھا، اہم اور مفید کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مختصر تاریخ ادب اردو اور نئے ادبی رجحانات وغیرہ زیادہ مقبول ہوئیں، اپنے شاگردوں میں بہت مقبول رہے، ان کی وفات سے اردو ادب ایک بہت ہی لائق مصنف اور خدمت گذار سے محروم ہو گیا، ان سے کچھ ہی روز پہلے ڈاکٹر مسیح الزماں ریڈر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی بھی وفات اچانک ہو گئی، اردو کی مرثیہ نگاری ان کا خاص موضوع تھا، ان کی عمر وفا کرتی تو اس صنف میں ان کا ادبی کارنامہ بڑا قابل قدر ہوتا، وہ پروفیسر مسعود حسن رضوی سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے داماد تھے، جن کے لئے اس کبر سنی میں یہ سانحہ بڑا ہی جانکاہ ہوگا،

دعا ہو کہ خدا اردو ادب کے ان دونوں خدمت گذاروں کو غریق رحمت کرے، آمین ثم آمین،

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

لڑائی کے موقع پر اسلام کی تعلیمات

سندھ میں حجاج اور محمد بن قاسم کی فوجی اور انتظامی رواداری ایک مثالی رواداری تھی، جنگ کے موقع پر بھی اسلام کی یہی روادارانہ تعلیمات رہی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مہم پر فوج بھیجتے تو سردار فوج کو حکم دیتے کہ کسی بوڑھے کو، بچہ کو، کمسن کو اور عورت کو قتل نہ کیا جائے، آپ کا یہ بھی حکم تھا کہ میدان جنگ میں کسی کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیران بدر کو آپ نے جب صحابہ کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے، چنانچہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے، غزوۂ حنین میں چھ ہزار قیدی تھے، سب چھوڑ دیے گئے آپ نے ان کے پہننے کیلئے کپڑے کے چھ ہزار جوڑے عنایت فرمائے، حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی عزت سے اس کو مسجد کے ایک گوشے میں ٹھہرایا، اور چند روز کے بعد سفر کا ساز و سامان کر کے ایک شخص کے ہمراہ یمن بھجوا دیا، ابو داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے، غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں، رسول اللہ صلعم کو خبر ہوئی، آپ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا، ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے۔

(سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۴۰ - ۴۴۳ - ۴۴۶)

حضرت ابو بکرؓ جب شام فوج بھیج رہے تھے تو رخصت کرتے وقت میر عسکر سے فرمایا کہ تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، ان کو چھوڑ دینا، میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں، کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کے سوا بیکار نہ ذبح کرنا، نخلستان نہ جلانا، مال غنیمت میں غبن نہ کرنا وغیرہ وغیرہ (تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۹۶ بحوالہ خلفائے راشدین دار المصنفین ص ۵۰)

ہندستان کے مسلمان فاتحین کی تلواروں پر ایک تبصرہ

اگر ان تعلیمات پر ہندوستان کے مسلمان فاتحین پورے طور پر عمل کرتے تو اسلام کی طرح ان کی فاتحانہ تلوار بھی پیام امن بن جاتی لیکن اگر انھوں نے ان پر عمل نہیں کیا تو وہ مورد الزام قرار دیے جا سکتے ہیں، اسلام یا اسلامی تعلیمات سے ان کی کسی بربریت کو منسلک نہیں کیا جا سکتا، مثلاً اگر کوئی مسلمان رہزن یا چور ہو جائے تو اس کی رہزنی اور چوری کا الزام اسلام پر نہیں رکھا جا سکتا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام میں وہ رہزن اور چور گھس آئے، اسی طرح مسلمان فاتحوں نے اسلامی تعلیمات کے خلاف جہاں کہیں ظالم اور سفاک بنکر لشکر کشی کی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلامی لشکر میں ظالم اور سفاک فوجی سردار گھس آئے تھے لیکن یہ کہنا بھی سراسر تاریخی حقیقت کے خلاف ہے کہ وہ ان تعلیمات کو بالکل ہی نظر انداز کر کے جنگ و جدل کرتے رہے، وہ محمد بن قاسم کا مثالی نمونہ تو پیش نہ کر سکے لیکن ان کی تلواریں ان کے اور معاصر فاتحین کے برخلاف فتح و تسخیر کے بعد ان کے نیام میں رہیں، حکومت کے نظم و نسق کو قائم رکھنے میں تو یہ تلواریں ان کے نیام سے باہر ضرور نکلتی رہیں، لیکن اشاعت اسلام کے سلسلہ میں یہ استعمال نہیں ہوئیں، اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی حکومت اور قوت کا مرکز آگرہ، دہلی، اودھ، بہار اور دکن رہا، مگر یہاں آج بھی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ کم ہے، اور جہاں ان کا اقتدار حکومت زیادہ مضبوط نہ تھا، جیسے بنگال، کشمیر اور سندھ جیسے دور دراز علاقوں میں

ان کی تعداد زیادہ ہوتی چلی گئی، اس حقیقت کا اعتراف انصاف پسند ہندو مورخین بھی کرتے ہیں مثلاً کے۔ ام پنیکر ہندوستان کے بڑے دیدہ ور مورخ گذرے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

فتح و تسخیر کے زمانے میں تو ہندوؤں کی صعوبتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، وہ یکایک بڑے علاقے سے اپنے سیاسی اقتدار سے محروم کر دیے گئے، ان کے مذہب کو بھی تحقیر سے دیکھا گیا اور انکی عبادت گاہیں بھی برباد کی گئیں لیکن جونہی فتح و کامرانی کا جوش ختم ہوتا، ملک کی اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے سے بڑے پرجوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ کاشتکار نہیں لائے تھے، دہلی پر فوج کے ذریعہ قبضہ ہی ہوا تھا، اور فوج ہی نے گنگا کی وادی کے راجاؤں کو شکست دی تھی، مسلمان سلاطین کیلئے لشکریوں کے ذریعہ زمین کی کاشت کرانا ممکن نہ تھا، زمین امراء میں جاگیر کے طور پر ضرور تقسیم کر دی گئی تھی لیکن کاشتکار ہندو ہی رہے، اسکی کبھی فکر نہیں کی گئی کہ ہندو زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمان بنا لیا جائے، اور نہ اشاعت اسلام کی کبھی کوشش کی گئی، کیونکہ دوآبہ میں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس رہی لیکن یہاں اب بھی ہندو ہی کی غیر معمولی اکثریت ہے، نظام اراضی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی، اس لیے گاؤں میں ہندوؤں کی زندگی ویسی ہی رہی جیسی کہ پہلے تھی۔ (اے سروے آف انڈیا ص ۱۳۲)

ہندستان سے عرب انشاء پردازوں مورخوں اور سیاحوں کی محبت

محمد بن قاسم ہی کی طرح عرب انشاء پردازوں، مورخوں جغرافیہ دانوں اور سیاحوں کا دل ہندوستان کی طرف سے نرمی، محبت اور ہمدردی سے بھرا رہا، کیونکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں ہندوستان کے فضائل اور یہاں کے باشندوں کے کمالات کا ذکر تو بہت ہی لطف و لذت کے ساتھ کیا ہے، ان کو اس ملک کی جو چیز پسند آجاتی اس کی تعریف دل کھول کر کرتے، مثلاً عربی زبان کے مشہور ادیب جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ)

لکھتا ہے کہ ہندوستان فکر و نظر کا سرچشمہ ہے (رسالہ فخر السودان علی البیضان ص ۸۰) سلیمان تاجر
رقم طراز ہے کہ اہل ہند لہو و لعب کو معیوب سمجھتے ہیں، اور آلات لہو کا استعمال نہیں کرتے (سلسلۃ
التواریخ ص ۵۲)۔ یعقوبی (المتوفی ۲۹۲ھ) نے لکھا ہے کہ ہندوستانی صاحب حکمت و بصیرت
ہیں، ہر قسم کی حکمت میں سب لوگوں سے فائق اور برتر ہیں، جوتش اور نجوم میں ان کے اقوال
سب سے زیادہ صحیح اور درست ہوتے ہیں (تاریخ یعقوبی جلد اول ص ۱۰۵)، احمد بن عمر بن رستہ
تو ہندوستان کے گندمی رنگ اور یہاں کے دل فریب حسن و جمال کا فریفتہ رہا، وہ تو اپنے
زمانے کے ہندو راجہ کے عدل و انصاف کا بھی بیحد معترف تھا، لکھتا ہے کہ تاجروں کے ساتھ
راجہ کا بہت ہی عمدہ برتاؤ رہتا (الاعلاق النفیسہ ص ۱۳۵)۔ اس نے ہندو مذہب کا بھی مطالعہ
کیا اور ملتان کے ایک بت کی بہت ہی عمدہ تصویر کھینچی ہے اور اس کی پرستش کی بڑی اچھی مرقع آرائی
کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ لوگ ان بتوں کے حضور میں جاتے ہیں تو گھٹنوں کے بل بیٹھکر اور ہاتھ جوڑکر
عرض کرتے ہیں کہ ہماری طرف نظر کرم ہو، ہم پر رحم کیجیے، روتے ہیں اور انتہائی عاجزی سے دعا کرتے
ہیں (ایضاً ص ۱۳۶)، مسعودی لکھتا ہے کہ حضرت آدمؑ اپنی ستر پوشی کے لیے جنت سے پتیاں
لائے، اور جب وہ خشک ہوگئیں تو ہواؤں نے ان کو اڑا کر پورے ہندوستان میں پھیلا دیا،
اسی لیے ہندوستان میں خوشبو اور عطر مثلاً عود، لونگ اور مشک وغیرہ زیادہ پائے جاتے ہیں
(مروج الذہب ج ۱ ص ۶۱۔۶۰)، مقدسی نے تو ہندوستان کے بہت مذہبی فرقوں مثلاً بہا فیہ،
دامانیہ، داودیہ، رشتیہ، مصفدہ، مہاکلیہ، جلنکنیہ وغیرہ کے عقائد و مراسم کا ذکر تفصیل سے
کیا ہے، وہ بعض برہمنوں کو موحد قرار دیتا ہے، بہوذیہ کے متعلق لکھتا ہے، اس کے پیغمبر بہا فوذ
نے اللہ کی پرستش کے لیے اس کا بت بناکر اس کی پوجا کرنے کی تعلیم دی ہے، تاکہ یہ بت دربار الٰہی
میں ان کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بن سکیں (البدء والتاریخ جلد چہارم ص ۱۵ - ۱۳)

دامانیہ اور دواتیہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ لوگ توحید کی طرح رسالت کو بھی مانتے ہیں (ایضاً)
رشتیہ کے ذکر میں کہتا ہے کہ یہ لوگ طویل مراقبہ اور دھیان کرکے اپنے ظاہری حواس کو بے کار
کر دیتے ہیں، تاکہ وہ دنیاوی آلودگیوں سے الگ رہیں، اور ان پر ملائکہ کے انوار و الطاف
اور تجلیات کا فیضان ہو (ایضاً) اصطخری کو بھی ملتان کی مورتیوں سے بڑی دلچسپی رہی، انکے
متعلق اپنی کتاب مسالک الممالک میں بڑی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

عربوں کے اچھے اثرات

جنوبی ہند میں عرب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ہی آنے لگے
تھے اور انھوں نے جنوبی ہند کے ساحلوں خصوصاً مالیبار میں اپنے اخلاق کی بلندی اور میل جول
کی رواداری سے ان کے علاقوں کے لوگوں پر اپنے خوشگوار اثرات پیدا کیے کہ ہندو راجاؤں کی
نظروں میں بھی کافی عزت، توقیر اور حیثیت حاصل کرلی تھی، اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ اپنی
مذہبی تبلیغ کرتے تو ان کی تبلیغی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کیجاتی، علاء الدین خلجی
کی فوج پہنچنے سے پہلے تامل اور جنوبی ساحل کے علاقوں میں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہوگئی تھی،
ان کی تجارتی منڈیاں قائم تھیں، ان کا میل جول وہاں کے باشندوں سے بڑھتا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ
ہندوؤں اور عربوں سے مل کر کئی مخلوط نسلیں مثلاً راوتن اور لبی پیدا ہوئیں، دسویں صدی
میں عرب مشرقی ساحل پر پہنچے، پہنچنے کے بعد ہی اپنی رواداری اور اخلاق سے پورے ساحل پر
چھا گئے، قلیل مدت میں سیاست اور معاشرت میں اہم حیثیت پیدا کرلی، ایک طرف تو وزراء
امیر البحر، سفراء کے عہدوں پر مامور ہوئے، دوسری طرف وہاں کے لوگوں کو مشرف باسلام
بھی کرتے رہے، اپنے مذہب کی تبلیغ کی، مسجدیں بنوائیں، مقبرے تعمیر کیے، جو ان کے مبلغوں
اور صوفیوں کے لئے تبلیغی مرکز بن گئے، اور بقول ڈاکٹر تاراچند ساتویں صدی کے بعد سے
جنوبی ہند میں ہندو مت میں جو کچھ نئے انقلابات آئے ہیں تو یہ اسلام ہی کے اثرات کے

نتائج ہیں (انفلوئنس آف اسلام آن انڈیا ص ۳۴۳) کاٹھیاواڑ، گجرات اور کوکن میں مسلمانوں
کی اچھی خاصی آبادی تھی، ہر جگہ ان کی ایک ایک مسجد تھی، ہندو راجے ان مسلمانوں سے فراخدلی
اور لطف کے ساتھ پیش آئے، سلیمان، مسعودی، ابن حوقل اور ابو زید گجرات کے وبھی راجہ بلہرا
کی مسلمان دوستی کی تعریف کرتے ہیں، سلیمان لکھتا ہے کہ گجرات کے بادشاہوں کی عمریں دراز ہوتی
ہیں، بعض بادشاہ پچاس سال تک حکومت کرتے ہیں، ان کے اہل ملک سمجھتے ہیں کہ ان کے بادشاہوں
کے عہد حکومت اور انکی عمروں کے طویل ہونے کا سبب عربوں سے محبت ہے، کوئی راجہ اور اسکی
رعایا بلہرا اور اس کی رعایا سے زیادہ عربوں سے محبت نہیں کرتی (سلسلۃ التواریخ از سلیمان تاجر ص ۲۶)
مسعودی کا ۳۰۳ھ میں ہندوستان آیا تو وہ لکھتا ہے کہ سندھ اور ہندوستان کے راجاؤں میں
راجہ بلہرا کی طرح مسلمانوں کو اور کسی کی حکومت میں عزت حاصل نہیں ہے، اسلام اس راجہ کی
سلطنت میں محفوظ اور معزز ہے، اس کے ملک میں مسلمانوں کی نماز پنجگانہ کی مسجدیں اور جامع مسجدیں ہیں
جو آباد ہیں، یہاں کے راجہ چالیس چالیس اور پچاس پچاس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک
راج کرتے ہیں، اس سلطنت کے باشندوں کا خیال ہے کہ ان کی عمریں عدل و انصاف اور
مسلمانوں کی عزت و توقیر کرنے کی وجہ سے لمبی ہوتی ہیں، اس راجہ کے یہاں فوجوں کو شاہی خزانہ
سے مسلمانوں کے بیت المال کی طرح تنخواہیں ملتی ہیں (مروج الذہب ج ا ص ۳۸۴) مسعودی
آگے چل کر لکھتا ہے "میں ۳۰۴ھ میں ہندوستان کے شہر چیمور میں جو راجہ و لبھ رائے کی مملکت
لار کا علاقہ ہے، موجود تھا، اس میں جو راجہ تھا اس کا نام جانچ تھا، اس وقت تقریباً دس ہزار
مسلمان وہاں آباد تھے، جو اصل میں بیاسرہ، سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دوسرے ملکوں
کے تھے لیکن ان علاقوں میں بود و باش اختیار کرلی ہے۔ ان میں سے بہت سے معزز اور بڑے
تاجر ہیں، جیسے موسیٰ بن اسحاق صندابوری اور ہنرمندی یعنی قضا کے عہدہ پر ان دنوں ابو سعید

معروف بن زکریا مامور تھے، ہنرمند سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے، اسکی شکل یہ تھی کہ راجہ کا قاعدہ
تھا کہ وہ کسی مسلمان رئیس ہی کو ان کا سردار بناتا تھا، اور مسلمانوں کے تمام معاملات اسی کے سپرد
ہوتے تھے، بیاسرہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، اس نام سے وہ مشہور ہیں
اس کا واحد بیسر ہے (ایضاً جلد دوم ص ۸۵)۔ استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے
کہ بیسر غالباً گجراتی لفظ ہے، جس کی اصل بے سرا ہے، جس کے معنی دو سروالا ہے، یعنی وہ شخص جو عربی
اور ہندی مخلوط نسل سے پیدا ہوا (عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۵۱)
اصطخری (۳۵۱ھ) لکھتا ہے کہ کھنبایت سے راجہ بلہرا کے شہر چیمور تک سب ہندوؤں کے شہر
ہیں مگر ان میں کچھ مسلمانوں کی بھی آبادی ہے، اور راجہ بلہرا کی طرف سے کوئی مسلمان ہی انکے معاملات
کا نگراں ہوتا ہے، ان شہروں میں مسجدیں اور جامع مسجدیں بھی ہیں جن میں نماز جمعہ ادا کیجاتی ہے
(مسالک الممالک ص ۱۰۲)۔ ادریسی گیارہویں صدی میں لکھتا ہے کہ نہروالہ میں کثرت سے مسلمان تاجر
آتے رہتے ہیں حکومت کی طرف سے مسافروں کا بڑا اعزاز و اکرام ہوتا ہے، ان کے مال و متاع
کی حفاظت کیجاتی ہے (نزہتہ المشتاق جزو ۸)۔ اور یہ معلوم کرکے شاید تعجب ہوگا کہ سومناتھ کے
راجہ کے یہاں مسلمان عہدہ دار بھی تھے (انفلوئنس آف اسلام ان انڈیا ص ۳۴۶)۔ جنوبی ہند
میں جو قوم موپلا کے نام سے مشہور ہے وہ دراصل عراق سے اس علاقہ میں آئے اور یہاں آباد ہوگئے
وہ گرم مسالے، ہاتھی دانت اور جواہرات کے تاجر بن کر آئے۔ ان میں اور ہندو راجاؤں میں
آشتی پیدا ہوگئی تھی، ہندو راجہ اپنے علاقہ میں تجارت کا بازار گرم رکھنے اور ترقی دینے کے خیال
سے ان مسلمان تاجروں کو اپنی حفاظت اور سرپرستی میں لے لیا اور ان کی وجہ سے اس علاقہ
میں تجارتی فروغ ہوا، خوشحالی بھی پیدا ہوئی، اسی لیے جب انھوں نے دعوتِ اسلام کے لیے
سرگرمی دکھائی تو انکی مزاحمت نہیں کی گئی (دعوت اسلام آر، ٹی، ڈبلو آرنلڈ اردو ترجمہ باب نہم)

کیا محمود غزنوی میں رواداری نہ تھی

ہماری بدنصیبی رہی ہے کہ ہم جنگ وجدل کی تاریخ تو بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن ایسے واقعات کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن سے باہمی موانست ویگانگت کا درس مل سکتا ہے، محمود غزنوی نے سومناتھ کو جس طرح برباد کیا، اس کی کہانی تو بہت دہرائی جاتی ہے لیکن اسی کے حالات زندگی میں یہ بھی ہے کہ جب اس نے متھرا کا مندر دیکھا تو اس کی شوکت وحشمت دیکھکر ششدر رہ گیا، اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسی عمارت بنانا چاہے تو لاکھوں سرخ دینار خرچ کرکے بھی نہیں بنا سکتا ہے، اور شاید دو سو برس میں بھی ایسی عمارت نہ بن سکے (تاریخ یمینی بحوالہ الیٹ جلد دوم ص ۴۴)۔ یہاں وہ نہ بت شکن بنا اور نہ بت فروش بلکہ اس مندر کے حسن وشوکت سے متاثر رہا، اس کی کوئی مثال نہیں کہ اس نے امن کی حالت میں کسی مندر کو منہدم کیا یا اس نے کسی ہندو کو ترک مذہب کرنے پر مجبور کیا، بلکہ غزنہ میں تو اس نے ہندوؤں کی بودوباش کے لیے ایک محلہ بھی آباد کر دیا تھا، (رسالہ الغفران معری بحوالہ دی لائف اینڈ ٹائمس آف سلطان محمود غزنہ از محمد ناظم ص ۱۶۳) جوامع الحکایات ولوامع الروایات میں ہے کہ امیر نصر جو خراسان کا امیر تھا، اور محمود کا چہیتا بھائی تھا، ایک بار وہ سلطان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا، اس کے زین خانے سے ایک جڑاؤ لگام چوری گئی، چوری پکڑی گئی تو چور ایک ادنیٰ درجہ کا ملازم تھا جو ہندو تھا، امیر نے حکم دیا کہ اس کو باندھ کر بیس کوڑے لگائے جائیں، سلطان کو یہ معلوم ہوا تو اس کو بہت دکھ ہوا، اس نے امیر نصر کو کہلا بھیجا کہ ہماری موجودگی میں ہمارے غلاموں کو تازیانے سے پٹواتے ہو اور ہماری ناراضگی کی پروا نہیں کرتے، اس کے بعد ایک ماہ تک اس کو اپنے حضور میں آنے کی اجازت نہیں دی (اردو ترجمہ از اختر شیرانی ص ۸۶-۸۷)، کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کی تحقیق ہے کہ محمود کے سکوں پر سنسکرت کے الفاظ پائے جاتے ہیں، اس کے سکوں پر ایک طرف تو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور دوسری طرف سنسکرت میں

اس کا ترجمہ ادی اکبتم ایکم محمد اوتار ہے، یہ صحیح ترجمہ تو نہیں، اس لیے کہ مسلمان محمدؐ کو اوتار نہیں مانتے، وہ آپ کو انسان ہی سمجھتے ہیں، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی اس سلسلہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کا اپنے سکوں پر سنسکرت لکھوانا اس کی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت ہے، جب پنجاب اس کی سلطنت کا جزو ہو گیا تو اس نے یہاں کی ہندو آبادی کو اپنی طرف اس طرح مائل کرنا چاہا، یہ اس کی عالی دماغی اور فراخدلی کی دلیل تھی (البیرونی یادگار جلد ایران سوسائٹی کلکتہ ص ۹۸)، سلطان محمود کا ہندوؤں کو اپنی طرف مائل کرنا کوئی تعجب انگیز بات نہیں، کیونکہ نہ صرف اس کے غزنہ اور پنجاب کے علاقے میں ہندو آباد تھے بلکہ اس کی فوج میں ہندو سردار اور لشکری بھی تھے، وہ طخرستان سے بڑھ کر بلخ ایلک خان سے برسرپیکار ہونے کے لیے گیا تو اس کے لشکر میں ترکوں، خلجیوں اور غزنویوں کے ساتھ ہندو لشکری بھی تھے، (تاریخ یمینی بحوالہ الیٹ جلد دوم ص ۳۰۲)

موجودہ دور کے بعض وسیع النظر اور فراخ دل ہندو مورخوں نے ہندوؤں کے ساتھ سلطان محمود کی رواداری کا اعتراف اچھی طرح کیا ہے، مثلاً ایشور ٹوپا نے لکھا ہے کہ موجودہ دور کے ایک مورخ کا خیال ہے، جو محمود غزنوی کا ناقد بھی ہے کہ وہ کوئی مبلغِ اسلام نہیں تھا، غیر مسلموں کو مسلمان بنانا اس کا مقصد نہیں رہا، الفنسٹن نے ہم کو یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطان گجرات میں عرصۂ دراز تک رہا، لاہور میں بھی اس کا قیام رہا، لیکن اس نے کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر ہی نہیں کی، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا، اس نے کسی بھی شخص کو اس کے ذاتی ضمیر کی بنا پر موت کی سزا نہیں دی، اس نے

لڑائی یا محاصرہ کے موقع پر تو ہندوؤں کو ہلاک کیا لیکن کسی اور موقع پر اسکے ہندوؤں کے ہلاک کرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے، اس کے دور حکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی رہی، ان کا تقرر نہ صرف انتظامی امور کے سلسلہ میں کیا جاتا بلکہ وہ فوج میں بھی بحال کیے جاتے، ان کے مذہب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا جس طرح فوج میں عرب، افغان، دیلمی، خراسانی اور غوری ہوتے، وہ بھی ہوتے، ہندو لشکری اپنے آقا کی خاطر کرمان، خوارزم اور مرو میں جاکر لڑے، غزنویوں کی فوجی مہموں کی تاریخ میں ہندو فوجی سرداروں میں تلک، سوندی رائے اور بیج رائے کے نام نمایاں ہیں، غزنویوں کی حکومت میں ان ہندو فوجی سرداروں کو اعلیٰ حیثیت حاصل رہی، وہ بڑے قابل اعتماد سردار سمجھے جاتے، غزنویوں کے ساتھ انکی وفاداری اور خدمت گذاری مثال کے طور پر پیش کیجاتی (پالٹکس ان پری موغل ٹائمس از ڈاکٹر ایشور ٹوپا ص ۴۶ - ۴۵)

سلطان محمود کی وفات کے پندرہ[۱۵] روز کے بعد ہی اسکے بیٹے سلطان مسعود نے ایک ہندو فوجی سردار سیوند رائے کو ہندو سواروں کی معیت میں اُن امراء کے خلاف بھیجا جو اسکے بھائی کے حامی تھے، پانچ سال کے بعد مسعود ہی کے حکم سے تلک نے ہندو سپاہیوں کے ساتھ نیالتگین کے خلاف لشکر کشی کی اور اس کو شکست دیکر ہلاک کر دیا، اس کے پانچ سال کے بعد سلطان مسعود سلجوق ترکمانوں سے مغلوب ہوکر غزنی سے ہندوستان چلا آیا تو اس نے یہاں ایک بڑی فوج اکھٹا کی جس میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی (تاریخ سبکتگین بحوالہ الیٹ جلد دوم ص ۶۰)

بیہقی نے اپنی تاریخ میں غزنوی دور کے ہندو فوجی سردار تلک کا ذکر جس طرح کیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندو اس دور حکومت میں تحقیر کے بجائے عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

تلک ایک حجام کا لڑکا تھا بصورت شکل اچھی پائی تھی، زبان بھی اچھی بولتا تھا، ہندی اور فارسی دونوں خط بہت ہی اچھا لکھتا تھا، کچھ دنوں کشمیر میں رہا، جہاں اس نے عشق بازی اور جادوگری وغیرہ کے فن میں بھی مہارت حاصل کرلی تھی، وہاں سے قاضی شیراز ابوالحسن کے یہاں آیا جو اس پر فریفتہ ہوگیا، قاضی نے اس کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کردی تو اس نے اس کی شکایت خواجہ احمد حسن سے کی، خواجہ اور قاضی میں تعلقات اچھے نہ تھے، خواجہ نے تین آدمیوں کی معرفت شاہی فرمان بھیجکر تلک کو اپنے پاس طلب کیا، قاضی کی ناخوشگواری کے باوجود تلک دربار میں پیش کیا گیا، خواجہ احمد حسن نے تلک کی شکایت سنی، پھر اس نے امیر محمود کی توجہ بڑی خوش سلیقگی سے اس معاملہ کی طرف دلائی، امیر مسعود نے خواجہ کو تلک کی شکایت سماعت کرنے کیلئے کہا جسکے بعد قاضی پریشانیوں میں مبتلا ہوگیا، اسکے بعد تلک خواجہ کا بڑا معتمد علیہ ہوگیا، وہ دبیر بنایا گیا، ہندوؤں سے جو باتیں ہوتی اسکا ترجمان ہوگیا، اس طرح اس نے وزیر کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل کرلیا، وہ خواجہ کے حضور میں برابر رہتا، اس کے پیغامات کو پہنچاتا اور مشکل معاملات کو حل کرتا۔

امیر مسعود کو جب خبر ملی کہ احمد نیالتگین نے لاہور میں باغیانہ روش اختیار کر رکھی ہے تو اس نے اپنے سپہ سالار اور فوجی سرداروں کو بلاکر ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ان سے مشورے طلب کیے، سپہ سالار نے اس بغاوت کو لاہور جاکر فرو کرنے کیلئے اپنی خدمت پیش کی، مگر امیر مسعود نے اس کو وہاں جانے سے یہ کہہ کر روکا کہ ابھی تو خراسان، ختلان، طخارستان کی بغاوتوں کو بھی فرو کرنا ہے، سندھ میں کسی اور فوجی سردار کو جانا چاہیے، تلک بھی اس مجلس میں موجود تھا، وہ بول اٹھا کہ میرے شاہی آقا کی عمر دراز ہو، اگر حکم ہو تو یہ خدمت اس سے لیجائے تاکہ وہ ان عنایات و احسانات کا بدلہ ادا کرسکے جن سے وہ ابتک سرفراز کیا جاچکا ہے، وہ ہندوستان کا باشندہ ہے، وہاں کا موسم گرم ہے، وہ آسانی سے وہاں کا سفر کرسکتا ہے، اگر وہ اس مہم کے لائق قرار دیا گیا تو وہ اپنا پورا فرض انجام دیگا، اسکی بات سنکر امیر

خوش ہوا اور جو لوگ وہاں موجود تھے، ان سے ان کی رائے دریافت کی، انھوں جواب دیا کہ وہ ایک مشہور آدمی ہے، اس فرض کو انجام دینے کے لیے بالکل موزوں ہے، اس کے پاس تلوار ہے، ساز و سامان ہے، آدمی بھی ہیں، اور شاہی عنایات بھی حاصل ہیں، یہ کام تکمیل کو پہنچا سکتا ہے، امیر نے اپنے مشیروں کو جانے کے لیے کہا تاکہ اس معاملہ پر وہ خود غور کر سکے، وہ مجلس سے چلے گئے،

امیر نے اپنے مخصوص مشیروں سے کہا کہ میرے حکام نے اس معاملہ میں زیادہ دلچسپی نہیں لی، اور نہ انھوں نے خاطر خواہ وفاداری کا اظہار کیا، اسی لیے تلک محجوب ہوا اور آگے بڑھکر اپنی خدمت پیش کی، اس کے بعد امیر نے تلک کے پاس ایک ایرانی دبیر پوشیدہ طور پر عنایات سے بھرے پیام کے ساتھ بھیجا کہ میں تمھاری ان باتوں کی قدر کرتا ہوں جو تم نے کہیں اور جو وعدہ کیا ہے، لیکن میرے اردگرد کے لوگوں نے اس کو پسند نہیں کیا، تم نے ان سب کو شرمندہ کیا، مگر تمھاری باتوں کو سچ ثابت کیا جائے گا، کل تم اس خدمت کیلئے نامزد کیے جاؤ گے، میں تمھارے لیے ہر ممکن بات کرونگا، میں تم کو کثیر سرمایہ دوں گا، ایک مضبوط فوج اور تمام ضروری سامان ساتھ کرونگا، تاکہ تمھارے ہی ذریعہ یہ کام انجام پائے اور یہ بغاوت کسی اور کے احسان کے بغیر فرو ہو جائے، تم اعلیٰ ترعہدہ پر فائز کیے جاؤ گے، یہ لوگ تو پسند نہیں کرتے کہ میں کسی آدمی کو ترقی دوں، کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی مرضی کے مطابق چلوں، گو وہ خود کچھ نہ کریں، تمھاری ترقی پر وہ رنجیدہ ہیں، اب تم اس کام کو انجام دینے کے لیے پورا عزم کر لو، انکی طرف سے قصور تو ہو چکا، جیسا کہ ان کے قول و فعل سے ظاہر ہے، جو ہوا سو ہوا، تلک نے زمین بوسی کر کے کہا کہ اگر یہ کام اس غلام کے بس سے باہر ہوتا تو اسکی زبان سے ایسی جرأت مندانہ باتیں اس مجلس میں آپ کے سامنے نہ نکلتیں، جب اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا ہے تو اس کام کو تکمیل تک پہنچائے گا، وہ کام کا نقشہ منظوری کے لیے پیش کرے گا، پھر وہ جلد روانہ ہو جائے گا، تاکہ اس بغاوت کو فرو کر سکے، اس ایرانی دبیر نے اگر یہ ساری باتیں دہرائیں، امیر نے ان کو پسند کیا، اور ان کو قلمبند کرنے کا حکم دیا، دبیر بڑی محنت سے اس

مہم کے نقشہ کو تحریر میں لے آیا جو تلک نے تیار کیا تھا، امیر نے تلک کو سارے اختیارات دیدیے تاکہ وہ باز غورک کو پار کرنے کے بعد ہندوؤں کو اطاعت گذار بنا سکے،

جب تلک لاہور پہنچا تو اس نے بہت سے اُن مسلمانوں کو قیدی بنالیا جو احمد نیالتگین کے دوست تھے، اور ان کے دائیں ہاتھ کٹوا دیئے، بقیہ اور لوگ جو احمد کے ساتھ تھے، اس سزا اور اختیارات سے خوفزدہ ہو کر رحم کے طالب ہوئے اور احمد کا ساتھ چھوڑ دیا، اسکے بعد حکومت کے مالی اور انتظامی امور کا مناسب نظم و نسق کیا گیا، تلک نے پورے اعتماد اور اختیارات کے ساتھ احمد کا تعاقب کیا، اسکے ساتھ بہت سے ہندو تھے جو زیادہ تر جاٹ تھے، اس تعاقب میں کچھ لڑائیاں اور جھڑپیں بھی ہوئیں، احمد ہر طرف بھاگتا پھرا، ایک سخت لڑائی بھی ہوئی جس میں احمد کو شکست ہوئی، اور وہ پھر فرار ہوا، ترکمانوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور تلک سے امان مانگی جو دی گئی، احمد تین سو سواروں اور ساتھیوں کے ساتھ بچ نکلا، تلک نے اس کے تعاقب میں کوئی کوتاہی نہیں کی، اور جاٹ باغیوں کو خطوط لکھے کہ وہ احمد کا ساتھ چھوڑ دیں، اور اگر وہ احمد کو گرفتار کر کے یا اس کو قتل کر کے اس کا سر لائیں تو ان کو پانچ لاکھ درہم انعام میں دیئے جائیں گے، احمد کا عرصۂ حیات تنگ ہوگیا، اسکے سارے آدمیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اور جاٹ بھی اس کا تعاقب کرنے لگے، اور جب احمد ایک ندی پار کرنے والا تھا تو دو تین ہزار جاٹ اسکے پاس پہنچ گئے، اس کے ساتھ دو سو سوار تھے، وہ خود تو ندی میں کود پڑا لیکن جاٹ اسکے مال و اسباب کو لوٹنے کے لیے ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، اور جب وہ اسکے پاس پہنچے تو اس نے اپنے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے مار ڈالنا چاہا لیکن جاٹوں نے ایسا کرنے نہیں دیا، اور اس کے لڑکے کو لے بھاگے، جو ایک ہاتھی پر سوار تھا، اس کے بعد وہ احمد پر تیروں، نیزوں اور تلواروں سے ٹوٹ پڑے، احمد نے بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن آخر میں مارا گیا، اور اس کا سر کاٹ کر علحدہ کر دیا گیا، جاٹوں نے اس کے مال و اسباب لوٹ کر اس کے ساتھیوں کو یا تو تہ تیغ کر دیا یا ان کو قیدی بنا لیا، ان کے سرداروں نے تلک کے پاس ان واقعات کی خبر دی،

تلک آس پاس ہی میں تھا، تلک کو انتہائی خوشی ہوئی، اس نے پیامبر بھیجکر احمد کا سر اور اسکے لڑکے کو طلب کیا، جاٹوں نے پانچ لاکھ درہم کا مطالبہ کیا، تلک نے جواب دیا کہ جب وہ احمد کی کثیر دولت لوٹ چکے ہیں تو پھر اس مطالبہ سے باز آجائیں، دو بار پیامبر آئے گئے، آخر میں اسی پر سمجھوتہ ہوا کہ جاٹ ایک لاکھ درہم لیکر راضی ہو جائیں، جب یہ رقم بھیجی گئی تو احمد کا سر اور اسکا لڑکا تلک کے سامنے پیش کیا گیا، تلک کا جب مقصد پورا ہوگیا تو وہ لاہور واپس ہوکر اس علاقہ کے نظم و نسق کی طرف رجوع ہوا، پھر دربار دراز ہوا، امیر نے تلک کو مبارکباد کے خطوط لکھوائے، تلک اور اس کے ساتھیوں کے احسانات کا شکریہ ادا کرکے ان کی تعریف کی۔ (الیٹ ج ۲ ص ۱۳۴ - ۱۲۵)

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ غزنویوں نے ہندوؤں کو بری نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ ان کے ساتھ پورے احترام اور ہمدردی سے پیش آتے رہے، یہ روایت محمود غزنوی ہی نے اپنے دور میں قائم کی تھی، جو اسکے جانشینوں نے برقرار رکھی، محمود غزنوی نے سومناتھ کے مندر کو جن اسباب کی بنا پر منہدم کیا، اس کے اسباب پر ہم بحث کرنا نہیں چاہتے، لیکن اس کے تمام اوصاف و محاسن کو نظر انداز کرکے اس کو محض اس لیے بہت برا سمجھا جائے کہ اس نے سومناتھ کو منہدم کیا، تو یہ خود بہت بڑی مذہبی غیر رواداری کا ثبوت ہے، مگر ہندوؤں میں کچھ ایسے مورخین بھی ہیں جو اس کو بہت برا سمجھنے کے لیے تیار نہیں، مثلاً سی، وی، ویدیہ نے اپنی کتاب ہسٹری آف مڈیول ہندو انڈیا جلد سوم میں اسکے متعلق جو اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اس کے جستہ جستہ اقتباسات یہ ہیں :-

محمود ایک جلیل القدر بادشاہ تھا، اس نے محض اپنی قوت بازو سے ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقہ کو ایک وسیع اور خوشحال سلطنت میں تبدیل کر دیا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا...... میرا خیال ہے کہ محمود ان افراد میں سے ہے جو قدرت کی طرف سے ایک عرصہ کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں، اور جن میں غیر معمولی قسم کی خوبیاں اور عدیم المثال صلاحیتیں ہوتی ہیں اور جو دنیا کی تاریخ اور قوموں کی قسمت بدل دیتے ہیں، ایک انسان

کی حیثیت سے وہ ایک سخت ضبط و نظم اور اعلیٰ کردار کا حامل تھا، اس کے حملوں میں اس کی مثالیں تو ملتی ہیں کہ شہر لوٹے گئے، مندر منہدم ہوئے، خونریزی ہوئی، قیدی غلام بنائے گئے، لیکن عورتوں کی عصمت ریزی یا انکے قتل و خون کی کوئی مثال نہیں ملتی، وہ عدل پسند تھا، اس لیے ظلم سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ اگر اسکا لڑکا بھی زنا کا مرتکب ہو جاتا تو اس کو قتل کر دینے کے لیے تیار ہو جاتا، وہ ایک اچھا حکمراں بھی تھا اور اچھا منتظم سلطنت بھی، عوام کو خوشحال بنانے کی کوشش میں برابر لگا رہا، اس نے قزاقوں کی سرکوبی کرکے تجارت کو فروغ دیا، اپنے دور دراز علاقوں کی شاہراہوں کو ہر طرح کے خطرے سے پاک کر دیا، لاہور اور خراسان کے درمیان تجارتی قافلے آزادی سے آتے جاتے رہے، اس نے صوبوں میں اچھے حاکم مقرر کیے، ان پر نگرانی رکھتا کہ وہ لوگوں پر ظلم نہ کرنے پائیں...... وہ سالانہ ایک لاکھ دینار عدل و انصاف اور عوام کی مرفہ الحالی اور خیرات و مبرات میں خرچ کیا کرتا تھا، اور یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ شہروں اور صوبوں میں عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر ان تمام فرائض کو انجام دیتا رہا جو ایک حکمراں کو دینا چاہیئے۔"

الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ایشوری پرشاد اپنی کتاب مڈیول انڈیا میں لکھتے ہیں :-

محمود نے تاریخ میں جو جگہ بنائی ہے اسکا تعین کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے، اپنے عہد کے مسلمانوں کی نظر میں تو وہ ایک غازی اور مذہب اسلام کا علمبردار تھا جس نے کفر کا خاتمہ کر دینا چاہا، ہندوؤں کی نظر میں آج بھی ایک سنگدل اور ظالم لٹیرا ہے، جس نے انکی مقدس عبادت گاہوں کو ملیامیٹ کرکے انکے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچایا، لیکن ایک غیر متعصب محقق اور مورخ اسکے زمانہ کی صورت حال کو پیش نظر رکھکر کچھ اور ہی فیصلہ دینے پر مجبور ہوگا، محمود بلا شبہ اپنے ساتھیوں کا ایک جلیل القدر رہنما، ایک انصاف پسند اور دیانتدار حکمراں، ایک باکمال اور پرجوش سپاہی، عدل و انصاف کا شیدائی، علوم و فنون کا مربی تھا، وہ بلاشک و شبہہ دنیا کے بہترین اور عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔" (مزید تفصیل کیلئے دیکھو میری کتاب ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک (ص ۳۰ - ۵۹)

البیرونی کی محبت کے نغمے

اور اگر بالفرض محمود غزنوی کی تلوار سے دہشت پھیلی تو اس سے کون انکار کرسکتا ہے، تو اسی کے دربار کے ایک اہل علم یعنی ابوریحان بیرونی کے قلم سے محبت کے نغمے آج بھی ہندستان کی فضا میں گونج رہے ہیں، اور اس کے پیار اور محبت کا قلم چرچا جارہا ہے۔ باہمی لاعلمی سے بیگانگی پیدا ہوتی ہے، بیگانگی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرہ کردیتی ہے، جس سے ذاتی، نسلی، اجتماعی خود بینی پیدا ہوتی ہے، اسکے بعد دل آزاری، مردم بیزاری، آبروریزی اور خونریزی شروع ہوجاتی ہے، اسی لاعلمی، بیگانگی اور بے تعلقی اور دوری کو دور کرنے کی خاطر البیرونی نے انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کے اُن ارباب علم وفن میں کیا جاتا ہے جن پر خود علوم وفنون کو فخر ہے۔ اس کی وفات کو ۹۴۴ سال گذر گئے لیکن اس طویل مدت کے باوجود اسکی اہمیت اور مقبولیت بڑھتی جارہی ہے، مختلف ممالک کی مختلف زبانوں میں اسکے علمی کارناموں کا احاطہ کیا جارہا ہے، اس کی علمی رواداری، مذہبی فراخدلی اور تحقیقی دیدہ وری کی داد ابتک دیجارہی ہے، اس کی علمی کاوشوں کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ وہ گوشت پوست کے بجائے علم وفن کا پیکر تھا، اس کے ذوق کی رنگارنگی کو دیکھئے تو اس کے ذہن کی تشکیل اور دماغ کی ساخت پر حیرت ہوتی ہے، وہ ہیئت، نجوم، علم کیمیا، تاریخ، ادب، طب، لغت میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ہی دنیا کے تمام مذاہب کے عقائد، آثار، مراسم حتی کہ توہمات اور خرافات پر گہری نظر رکھتا تھا، وہ عربی وفارسی کے علاوہ عبرانی اور سریانی سے بھی واقف تھا، سنسکرت بڑی ریاضت سے سیکھی اور اس زبان کی اہم تصانیف پر اس کو کامل عبور ہوگیا تھا۔

البیرونی کا علم وفن

وہ بحرالعلوم ہوکر سینہ کی امانت سفینہ میں منتقل کرنے کی فکر میں لگا رہا، اس نے ۷۵ سال کی عمر پائی، اسکی ساری عمر علم وفن کی خدمت میں گذری، شروع میں تو اس نے تنگدستی اور عسرت میں زندگی گذاری لیکن جب اپنی علمی شہرت کی بنا پر شاہی درباروں سے وابستہ ہوا تو اسکے دن اچھے گذرنے لگے، پہلے وہ

شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار سے منسلک ہوا، پھر خوارزم شاہ نے اس کو اپنے دربار میں بلا کر بڑی عزت و احترام سے رکھا جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ وہ ایک بار البیرونی کے مکان سے گھوڑے پر سوار ہوکر گذر رہا تھا، تو اس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی جب البیرونی اپنے حجرے سے اس کے پاس آیا تو اس نے گھوڑے سے اترنا چاہا، بیرونی کے قسم دیکر اس سے گھوڑے سے اترنے سے منع کیا لیکن اس نے ایک عربی شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ علم سب سے زیادہ معزز ملک ہے کہ تمام لوگ اس کے پاس آتے ہیں اور وہ خود نہیں آتا، (معجم البلدان ج ۶ ص ۲۱۰-۲۰۹)۔ خوارزم شاہیوں کی تباہی کے بعد البیرونی سلطان محمود غزنوی (وفات ۱۰۳۰ء) کی علم نوازی سے مستفیض ہونے لگا، پھر اسکے بیٹے سلطان مسعود کے سایۂ عاطفت میں آگیا جس کے نام پر اس نے متعدد کتابیں لکھیں، ان میں زیادہ مشہور قانون مسعودی ہوئی، سلطان مسعود کے لڑکے شہاب الدین ابوالفتح مودود کے دربار سے بھی وابستہ ہوا، اس کے نام پر کتاب الدستور لکھی (شہرزوری قلمی نسخہ ص ۹۳)۔ شاہی درباروں سے وابستگی کے باوجود وہ درباداری سے بے نیاز ہوکر اپنے علمی کاموں میں لگا رہا، شہرزوری نے لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتا تھا، اس کا ہاتھ قلم کو، اس کی آنکھ مطالعہ کو اور اس کا دل غور وفکر کو صرف نوروز کے اوقات میں چھوڑتا تھا، اس کی تصنیفات ایک اونٹ کے بار سے زیادہ ہیں (شہرزوری قلمی نسخہ ص ۹۳) خود البیرونی نے اپنی کتاب آثار الباقیہ میں اپنی تصانیف کی تعداد ۱۱۳ بتائی ہے، لیکن آثار الباقیہ اس کی وفات سے تیرہ سال پہلے لکھی گئی تھی، اس کے بعد بھی اس نے تصنیفی شغل کو جاری رکھا، وہ نزع کے عالم میں بھی علمی مسئلہ حل کرتا رہا، معجم البلدان میں یاقوت نے لکھا ہے کہ فقیہ ابوالحسن علی بن عیسٰی الوالجی کا بیان ہے کہ میں ابوریحان کے پاس ایسی حالت میں گیا، کہ وہ دم توڑ رہا تھا لیکن اس حالت میں بھی اس نے کہا کہ تم نے جدات فاسدہ کے حساب کے متعلق مجھ سے ایک دن کیا کہا تھا، مجھ کو اس پر رحم آیا، اور میں نے کہا کہ اس حالت میں؟

ابوریحان نے کہا کیا اس مسئلہ کا علم اس سے بہتر نہیں ہے کہ میں دنیا کو اس حالت میں چھوڑوں کہ اس سے جاہل رہوں، چنانچہ میں نے اس مسئلہ کو دوبارہ بیان کیا اور اس نے اس کو یاد کر لیا، اس کے بعد میں اسکے پاس سے نکلا تو راستہ ہی میں تھا کہ رونے پیٹنے کی آواز سنی (معجم الادباء ج ۶ ص ۳۹-۳۰ نیز حکمائے اسلام از مولانا عبد السلام ندوی جلد اول ص ۶۷-۳۶۶)

البیرونی کی کتاب الہند رواداری کا ایک شاہکار

البیرونی کی تمام تصانیف میں ہندوستان اور اس سے باہر بھی کتاب الہند کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، جو عربی زبان میں لکھی گئی، اس کا پورا نام کتاب ابی الریحان محمد بن احمد البیرونی فی تحقیق ما للہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولہ ہے، اس میں ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات مثلاً ارواح کی حالت، تناسخ، مجامع اور مقامات جزا، منصوبات یعنی خاص خاص بت جو خاص خاص مقامات میں نصب کئے گئے، رگ بید، جزر بید، سام بید، اتھربن بید، پران ہندوؤں کی دوسری دینی کتابیں، ان کے علم نحو، علم عروض، اوزان، ماترہ، ثنائی، سداسی، خماسی، بجرین، پد، نجوم، تول ناپ، پیمائش کے طریقے، رسم الخط، رسوم، عادات، جادو، رساین، جھاڑ پھونک، پھر ہندوستان کے شہروں، دریاؤں، سمندروں، جزیروں، یہاں کے ملکوں کے فاصلے اور حدود، پھر ستاروں، بروج مہتاب، سبعہ سیارہ، ہفتے کے دنوں، برہمانڈ، زمین، سمندر کی وسعت، آسمان، قطب کی پیدائش کے افسانے، برہما، کلپ، چترجگ، منترات، نارائین، باسدیو، بھادات، ادھی ماسہ، اونزاتر، نبات النعش، اہرگن، سال کی تحلیل سے متعلق ہندوؤں کے تخیلات، ان کے معاشرتی رسوم، مقدس مقامات اور تالاب وغیرہ کی تفصیلات ہیں،

ہندوؤں کے علم نجوم کے مطابق ستاروں کی ترتیب، ماہتاب کی منزلیں، آفتاب کے گرہن، سمندر کے پانی پر لے در پے مد وجزر وغیرہ کا ذکر ہے، پھر ہندوؤں کے مختلف طبقات کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی مرقع کشی کی ہے، آخر میں ہندوؤں کے نجومی احکام کے اصول، مدخل اور اسکے متعلق انکے طریقۂ عمل کا مختصر بیان ہے،

ان تمام موضوعات سے متعلق البیرونی کو معلومات فراہم کرنے میں جو ریاضت کرنی پڑی وہ خود اپنی جگہ پر ایک دلچسپ موضوع ہے، اس کا بیان ہے کہ جب اس نے ہندوؤں کے علوم سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی، تو اسکو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں، اس کیلئے سنسکرت زبان کا سیکھنا بہت ضروری تھا، مگر یہ بہت مشکل کام تھا، کیونکہ بقول اسکے ہماری زبان وحلق میں ان کو انکے اصلی مخارج سے نکالنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے اور نہ ہمارے کان ان کو سنکر مماثل ومشابہ حروف میں تمیز کرتے ہیں، اور نہ ہمارے ہاتھ کتابت میں ان کی نقل کر سکتے ہیں، اسی وجہ سے ان کی زبان کی کسی چیز کو ہمارے رسم خط میں قلمبند کرنا مشکل ہے، اس کے علاوہ اس کا بیان ہے کہ اس زمانہ کے ہندو جو کچھ جانتے تھے، اس کو بتلانے میں بخل کرتے، غیر قوم والے درکنار خود اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی سرشت میں داخل ہے (کتاب الہند ص ۱۲) مگر وہ ان مشکلات سے مطلق نہیں گھبرایا، اس نے بڑی محنت سے سنسکرت زبان سیکھی، پھر اپنی بے تعصبی اور آزاد خیالی کی وجہ سے پنڈتوں اور برہمنوں سے مل کر، ان کے علوم سے واقفیت حاصل کرتا رہا، اور جب وہ ان سے واقف ہو کر خود ہندوؤں کو، ان اصولوں کو جن پر انکے احکام ومسائل کی بنیاد تھی، بتلانا، ان کے بعض دلائل کی طرف اشارہ کرنا اور ان کے حسابات صحیح طریقہ پر سمجھنا شروع کیا، تو وہ تعجب کرتے ہوئے اسکی طرف لپکے اور خود اس سے کچھ سیکھنے کے لیے پروانہ وار گرتے اور اس ہندو عالم کو دریافت کرتے تھے جس سے اس نے علم حاصل کیا، وہ اس کو جادوگر کہنے لگے اور اپنے بڑے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر اپنی زبان میں سوائے لفظ بحر یعنی سمندر کے اور ایسے پانی کے جو اسقدر ترش ہو جائے کہ سرکہ سے بھی بڑھ جائے، دوسرے لفظ سے نہیں کرتے تھے، (کتاب الہند عربی ص ۱۲، اردو ترجمہ ج اول ص ۲۱-۲۰) اس نے ہندوؤں کی کتابیں جمع کرنے میں بے دریغ روپے خرچ کیے، اور جن جن گمنام اور مخفی مقامات میں ہندو پنڈت رہا کرتے تھے، وہاں بہنچکر ان کی صحبتوں میں رہا، اس طرح بقول اسی کے ٹھکریوں میں ملے ہوئے سیپ، گوبر میں لپٹے ہوئے موتی اور سنگریزوں میں پڑے ہوئے نگینوں کو علٰحدہ کرکے اپنی تصنیف کتاب الہند تیار کی جس کے متعلق ایڈورڈ سخاؤ

کا بیان ہو کہ اگر مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ یہ عربی لٹریچر کے افق پر ایک بہت ہی اہم ستارہ ہے تو ہندوؤں کو بھی اپنی خوش بختی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ایک صداقت پسند اور اعلیٰ قسم کے اہل علم نے انکے آباء و اجداد کے تمدن کی ایک تصویر بنا کر چھوڑی ہے، اس نے جو کچھ بیان کیا ہے، اسکے بعض حصول سے ہندوؤں کو اتفاق نہ ہو، اسکی بعض تنقیدوں سے ان کو الجھن بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اسکے بھی وہ اعتراف کرینگے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اہم صداقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی اور اس بات کو ہندو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں کہ اس نے جا بجا ان کے تمدن کی تعریف و تحسین غیر مشروط طریقہ پر کی ہے (کتاب ابی الریحان محمد بن احمد البیرونی فی تحقیق ماللہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ دیباچہ انگریزی) پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی (کلکتہ یونیورسٹی) نے لکھا ہے کہ البیرونی بیرونی لوگوں میں پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے علوم و فنون کو سیکھ کر نمایاں شہرت حاصل کی اور اب بھی اس کا شمار ہندی علوم و فنون کے جاننے کی صف اول میں کیے جانے کے لائق ہے، اس کے علم میں بڑی وسعت اور صداقت تھی، پھر رواداری اور حقیقت پسندی بھی تھی، اس لحاظ سے وہ بنی نوع انسان کے ان رہنماؤں میں سے ہے جو ذہن و فکر پر اثر انداز ہوئے (البیرونی یادگار جلد انگریزی شائع کردہ ایران سوسائٹی کلکتہ ص ۲۳)

علامہ شبلی رقم طراز ہیں کہ یہ کتاب درحقیقت سنسکرت علوم و فنون کا نہایت عمدہ خلاصہ ہے، مصنف نے سنسکرت کی بہت سی مستند اور قدیم تصنیفات سے ذخیرۂ معلومات مہیا کیا ہے، (مقالات شبلی ج ۶ ص ۱۰۴) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب ابو ریحان بیرونی نے ہندوستان کا سفر کر کے وہاں کے علوم و فنون اور رسم و عادت پر کتاب لکھی تو تمام پچھلی تصنیفیں بازیچۂ اطفال بن گئیں (ایضاً ص ۲۵)

مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ جب ہندوستان کی سرزمین سلطان محمود کے حملوں سے زیر و زبر ہو رہی تھی عین اسی وقت علم و فن کا دوسرا سلطان تن تنہا نہایت اطمینان اور چپکے سے ہندوستان کی علمی فتوحات میں مصروف تھا، اس سیاسی لڑائی بھڑائی اور خلفشار پر دل ہی دل میں

جل رہا تھا، اس نے کتاب الہند لکھ کر جیسا کہ ڈاکٹر زخاؤ نے کہا ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ فخر تھا کہ انکے ایک فرد نے ایک ایسی کتاب لکھی جس نے یونانی سفیروں اور چینی سیاحوں کے ہندوستان کے متعلق بیانات کو تقویم پارینہ بنا دیا تو دوسری طرف ہندوستان پر یہ احسان کیا کہ اس کے پرانے تمدن، پرانے علوم اور پرانے خیالات کو دنیا میں باقی رکھا (عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۷۶-۱۷۵)

اس کتاب کا ہر باب پر از معلومات بھی ہے اور دلچسپ بھی، اور جو کچھ البیرونی لکھتا ہے، اسکی سند میں حوالے بھی دیتا ہے، پاتنجلی، گیتا، بشن دھرم، پران، اوت پران، بشن پران، مہابھارت، برہما سدھانت وغیرہ جیسی کتابوں کے حوالے بار بار آتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ان کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس زمانے کے ہندوؤں کے مذہبی، علمی اور معاشرتی حالات کے ساتھ جا بجا اس ملک سے متعلق اس نے جو جغرافیائی معلومات دیے ہیں وہ سب کے سب لطف و لذت کے ساتھ مطالعہ کے لائق ہیں، اس مضمون میں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، اسلیے ہم اس کی خاص خاص باتوں کا ذکر کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں،

خدا کی ذات و صفات سے متعلق ہندوؤں کے عقائد کا مطالعہ

ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات مثلاً ہندو پران، مہابھارت، ہندوؤں کی دوسری دینی کتابیں، انکے علم نحو، عروض، اوزان، آثار ثلاثی، سداسی، خماسی، وید، نجوم، رسوم، عادات، جادو، جھاڑ پھونک، برہما، کلپ، نارائن، باسدیو اور انکے مقدس مقامات اور تالاب وغیرہ پر اپنی کتاب میں ایسی معلومات فراہم کی ہیں جن سے آج بھی بڑے بڑے پنڈت استفادہ کر سکتے ہیں، ان تمام چیزوں کا مطالعہ مخالفانہ یا متعصبانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ، محققانہ اور حقیقت پسندانہ ہے، وہ پاتنجلی، گیتا اور سانکھ کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ خدا کی ذات اور صفات کے متعلق ہندوؤں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ واحد ہے، ازلی ہے، جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اپنے فعل میں مختار ہے، قادر ہے، حکیم ہے، زندہ ہے، زندہ رکھنے والا ہے، صاحب تدبیر ہے، باقی رہنے والا ہے، اپنی بادشاہت میں یگانہ ہے، جس کا کوئی مقابل اور مماثل نہیں، نہ وہ کسی چیز سے مشابہ ہے اور نہ کوئی چیز اسکے ساتھ مشابہت رکھتی ہے (عربی ص ۱۳ اردو ترجمہ ج اول ص ۲۴)

وہ لکھتا ہے کہ کتاب گیتا میں جو باسدیو اور ارجن کے باہمی مکالمہ میں کتاب مہا بھارت کا ایک حصہ ہے، باسدیو نے کہا ہے "بلاشبہ میں وہ کل ہوں جس کی نہ ولادت سے ابتدا ہے نہ موت سے انتہا، میرا مقصود اپنے فعل سے مکافات نہیں اور نہ میں محبت یا عداوت کی بنا پر ایک طبقہ کے مقابلہ میں دوسرے طبقہ کی کوئی خصوصیت رکھتا ہوں، میں نے اپنی ہر ایک مخلوق کو وہ چیز جس کی وہ اپنے فعل میں حاجت رکھتا ہے دے رکھی ہے، پس جو شخص مجھکو اس صفت کے ساتھ پہچانتا ہے اور خواہشات کو عمل سے دور رکھنے میں میری مشابہت اختیار کرتا ہے اس کی بندش کھل جاتی ہے، اور اسکی نجات اور آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

(عربی ص ۱۴ - اردو ترجمہ ص ۲۸)

ایشور کے متعلق ہندوؤں کا جو عقیدہ ہے اس کے متعلق البیرونی نے یہ لکھ کر وضاحت کی ہے، ان کے نزدیک وہ مستغنی ہے، جواد ہے، دیتا ہے مگر لیتا نہیں، اسی کی وحدت کو خالص وحدت سمجھتے ہیں، اس لیے کہ اس کے ماسوا کی وحدت کسی نہ کسی حیثیت سے کثرت رکھتی ہے، اس کے وجود کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اس لیے کہ دوسرے موجودات کے وجود کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اس لیے کہ دوسرے موجودات کے وجود کا سبب اور سہارا وہ ہے، یہ توہم کہ سب موجودات معدوم ہیں، اور وہ موجود ہے محال نہیں ہے، اور یہ توہم کہ وہ موجود نہیں ہے اور سب موجودات موجود ہیں، محال ہے (عربی ص ۱۳-۱۵ - اردو ترجمہ ص ۲۶) وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچا تھا کہ ہندوؤں کے خواص اور عوام کے مذہبی اعتقادات میں اختلاف ہے لیکن ہندو عوام کے بھونڈے اعتقادات کو تحقیر سے دیکھنے کے بجائے ان پر یہ لکھ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس قسم کے اعتقادات دوسرے دینوں میں بھی ہیں، بلکہ اسلام میں بھی تشبیہ، جبر اور کسی شے میں غور و فکر وغیرہ کے اقوال موجود ہیں، جن کی اصلاح واجب ہے۔ (عربی ص ۱۵ - اردو ترجمہ ص ۲۹)

بت پرستی کا تجزیہ

اس نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بت پرستی ہندو عوام کا طریقہ ہے، خواص ہندو اس سے بری ہیں، وہ لکھتا ہے کہ جو شخص نجات کی راہ کا طالب ہے یا جس نے مناظرہ و کلام

کا مطالعہ کیا اور حقیقت کو جاننا چاہا ہے، جس کو یہ لوگ سار کہتے ہیں، وہ اللہ کے سوا ہر دوسری چیز کی عبادت سے پاک دامن ہے، بنائی ہوئی صورت کی عبادت کیا کرے گا، اس کی تائید میں گیتا کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ بہت سے لوگ اپنی اغراض کے لیے میرے غیر کے ذریعہ ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور میرے ماسوا کے لیے اس کا وسیلہ بناتے ہیں، ہم ان لوگوں کو قوت اور توفیق دیتے ہیں اور ان کی مراد تک پہنچا دیتے ہیں، اس لیے کہ ہم ان سے مستغنی ہیں۔ (عربی ص ۵۴ باب ۱۱ - اردو ترجمہ ص ۱۴۴، ۱۵۸ حصہ اول)۔ اپنے ان خیالات کے باوجود اس نے عام معلومات کے لیے بت پرستی کی تاریخ، ملتان، تھانیسر، کشمیر کے بتوں، پھر رام، بشن، بلدیو، برہما، اندر، مہادیو، بدھ، ریونت آفتاب امہات سبعہ وغیرہ کی مورتیوں کا حال بڑی تحقیق اور تفصیل سے لکھا ہے، جس کے قلمبند کرنے میں تحقیر کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔

شودروں کے ناروا سلوک پر البیرونی کی تکلیف

البیرونی کا دل تو ہندوستان کے اس طبقہ کے لیے بھی بڑا نرم اور گداز رہا جس کو شودر کہا جاتا ہے، لکھتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ برہمن اور کشتری کے سوا دوسروں کو جن کے لیے بید سیکھنا تک ممکن نہیں ہے، نجات نہیں مل سکتی، ان کے محققین کا قول ہے کہ نجات ان طبقوں اور کل نوع انسانی کے لیے مشترک ہے، بشرطیکہ ان لوگوں میں نجات کے حاصل کرنے کا کامل ارادہ پیدا ہو جائے، اس کی دلیل بیاس کا یہ قول ہے کہ پچیس باتوں کو تحقیق کے ساتھ جان لو پھر جو دین چاہو اختیار کرو، یقیناً نجات پاؤ گے، اور اس دلیل سے بھی کہ باسدیو شودر کی نسل سے آیا تھا، اور باسدیو نے ارجن سے کہا تھا کہ اللہ بغیر اس کے کسی پر ظلم کرے، یا کسی سے محبت رکھے، مکافات دیتا ہے، اگر آدمی نیک کام میں اللہ کو بھول جائے تو وہ اس کام کو برا بنا دیتا ہے، اور برے کام میں وہ یاد رہے اور بھولا نہ جائے تو اس کے نیک بنا دیتا ہے، اگرچہ کرنے والا بیش یا شودر یا عورت ہو، چہ جائیکہ برہمن یا کشتری ہو (عربی ص ۱۵ - اردو ترجمہ ص ۱۳۳ حصہ اول)

ذات پات کی تفریق سے شودر کو جو نیچا درجہ دیا گیا ہے، اس سے بھی البیرونی کو تکلیف ہوتی، جس کو اس نے یہ لکھکر دور کیا ہے کہ یہ سارا تفرقہ درجات کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے، جس میں ایک شخص دوسرے کو مسخر یا محکوم بنا لیتا ہے، ورنہ باسدیو نے غالب نجات کے حق میں کہا کہ عقلمند کے نزدیک برہمن اور چنڈال دوست اور دشمن، امانت دار اور خائن، سانپ اور نیولا برابر ہیں، اور اگر عقل سب کو مساوی ٹھہراتی ہے تو فرق اور برتری جہالت کی پیدا کی ہوئی ہے۔

(عربی ص ۲۷۱ ۔ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۳)

البیرونی کا عالمانہ اور منصفانہ انداز بیان

البیرونی نے ہندو مذہب کے کسی پہلو کو بری نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے، اسی لیے اس کو اس مذہب کی کسی بات سے اختلاف کہیں کہیں ہوا ہے، تو اس سے نہ خود برگشتہ ہوتا ہے، اور نہ اپنے ناظرین کو برگشتہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ اپنا اختلاف عالمانہ اور منصفانہ طور پر ظاہر کرتا ہے، جس میں مناظرانہ رنگ نہیں پیدا ہونے پایا ہے، وہ ہندوؤں کے اعلیٰ پایہ کے فلسفی، ریاضی داں اور ماہر ہیئت ہونے کا قائل ہے، اس کو ہندوستان کے فلسفہ سے بھی دلچسپی رہی، وہ ہندوؤں کے فلسفہ کو یونانیوں، مجوسیوں، یہودیوں عیسائیوں اور صوفیوں کے فلسفہ سے مقابلہ اور موازنہ کرتا ہے، اور کہیں کہیں تو ہندوؤں کی عقل و دانش کا مداح ہو کر اپنے خیالات کو بڑی عرق ریزی اور دقت نظر سے تطبیق دینے کی کوشش کرتا ہے، وہ ہندوؤں کے نجوم و ہیئت کے ساتھ ان کی صنعت و دستکاری کا بھی معترف رہا، پھر ہندوؤں کے نہانے کے تالابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس فن میں ہندوؤں کو کمال حاصل ہے، مسلمان جب ان کے تالابوں کو دیکھتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں، اور ایسے تالاب بنانا تو درکنار ان کے بیان سے بھی عاجز رہ جاتے ہیں۔

(باقی)

شرح السُّنۃ امام بغوی

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

لغت و عربیت

غریب الفاظ و لغات کا حل اس شرح کی اہم خصوصیت ہے، اس لئے اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں تاکہ عربیت میں مصنف کے کمال اور الفاظ و لغات کی تحقیق میں اُن کی دیدہ ریزی و کاوش کا اندازہ ہو سکے،

ایک جگہ قنوت کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کے چار معانی ہیں، (۱) نماز جیسا کہ اللہ نے فرمایا:۔

امن ھو قانت اٰناء اللیل	بھلا وہ شخص جو رات کے وقتوں
ساجداً و قائماً	میں سجدہ ریز ہو کر اور قیام کرکے
(زمر - ۹)	نماز پڑھتا ہے،

(۲) طول، قیام (دیر تک کھڑا رہنا) جیسے ایک حدیث میں ہے،

افضل الصّلوٰۃ طول	بہترین نماز وہ ہے جس میں طویل
القنوت	قیام کیا جائے،

(۳) اطاعت و فرمانبرداری، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے بارہ میں کہا گیا ہے:

كان أمة قانتا لله، — وہ اللہ کے مطیع و فرمانبردار تھے، (نحل: ۱۲۰)

(۴) سکوت، چنانچہ قرآن میں ہے :-

قوموا لله قانتين ○ — (نمازوں میں) خدا کے حضور خاموشی سے کھڑے رہو، (بقرہ ۲۳۸)

یہاں قانت کے معنی ذاکر (اللہ کو چیتنے والا بھی لیا گیا ہے[1]"

(جلد سوم ص ۳۴۴)

ایک حدیث میں لم یلغ (اس نے لغو یعنی بیہودہ گوئی نہیں کی) کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اس کے معنی (لم یتکلم) (اس نے بات چیت نہیں کی) ہے خطبہ کے وقت میں بات چیت کرنے کو لغو کہا گیا ہے، حدیث میں ہے،

اذا قلت لاخیک انصت و الامام یخطب فقد لغوت، — اگر امام کے خطبہ دینے میں تم اپنے ساتھی سے "چپ رہو" کہو تو تم نے لغو (بات چیت) کیا،

ایک اور روایت میں ہے :-

---

[1] یہاں بھی مصنف کا بیان محل نظر ہے، درحقیقت قنوت کے معنی اطاعت و فرمانبرداری ہی کے ہیں، باقی سب تشریحی و توضیحی معانی ہیں "آیتوں کے ترجمہ میں مصنف کے خیال کی رعایت کی گئی ہے ورنہ پہلی آیت (امن ھو قانت الخ) اور آخری آیت (قوموا للہ الخ) میں قنوت کا مناسب ترجمہ فرمانبرداری" اطاعت ہی ہوگا،

من مس الحصى فقد لغا — جس نے کنکری چھوئی تو اس نے لغو (بات چیت) کیا،

بعض اہل لغت نے اس کے معنی درست اور ٹھیک کام سے منحرف ہونے اور بعض نے خائب اور خاسر ہونے کے لئے ہیں، دراصل الغاء کے معنی اسقاط (ساقط کرنا، چھوڑ دینا) ہیں، اس لئے لغو ہر اس چیز کو کہیں گے، جو ساقط کرنے، چھوڑ دینے اور پھینک دینے کے لائق ہو، قرآن مجید میں ہے،

لا یسمعون فیها لغوا، — (اہل جنت، جنت میں) کوئی لغو بات نہ سنیں گے، (واقعہ - ۲۵)

دوسری جگہ ہے،

والغوا فیه، — اور (قرآن پڑھا جائے تو) لغو گوئی کرو، (فصلت: ۲۶)

اسی لئے بلا نتیجہ اور بے فائدہ بات چیت کو لغو کہتے ہیں، کہا گیا ہے کہ

ایاکم وملغاة اول اللیل، — اوائل شب میں باطل اور بے سود بات چیت سے بچو، (جلد ۴ ص ۲۳۸)

بعض لفظوں کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں، جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"منافق کو منافق اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کفر کو پوشیدہ اور مخفی رکھتا ہے، اس لئے وہ اس شخص کے مانند ہے جو نفق (سرنگ) میں داخل ہو کر چھپ جاتا ہے، بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ یہ نافقاء الیربوع (چوہے کے مخفی سوراخ) سے بنا ہے، کیونکہ چوہے کے ایک سوراخ کو نافقا اور دوسرے کو قاصعاء کہتے ہیں، وہ قاصعاء سے

داخل ہو کر نافقاء سے نکلتا ہے، اسی طرح منافق جس راستے سے ایمان میں آیا تھا، اس کے بجائے دوسرے راستے سے نکلتا ہے،

(جلد اوّل ص ۱۷۰، ۲۷۰)

فرض نمازوں کے آخر میں پڑھی جانے والی تسبیحات کو معقبات کہے جانے کی وجہ یہ تحریر کی ہے:۔

"تسبیحات یکے بعد دیگرے پڑھی جاتی ہیں، اس لئے ان کو معقبات کہا گیا ہے، تعقیب کسی کام کو یکے بعد دیگرے کرنے کو کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ولی مدبرا ولم یعقب،	(موسیٰؑ نے) پیٹھ پھیری اور دوبارہ
(نمل - ۱۰)	نہ مڑے،

یہاں "لم یعقب" کے معنی لم یرجع لئے گئے ہیں، یعنی سانپ کے ڈر کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے جب پیٹھ پھیری تو دوبارہ لوٹ کر پھر اُس کے سامنے نہیں آئے۔ دوسری جگہ ہے:۔

لہ معقبات،	انسان کے لئے باری باری آنے والے
(رعد - ۱۱)	(فرشتے) ہیں،

یعنی انسان کے ساتھ ایسے فرشتے ہوتے ہیں، جو یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں، ایک حدیث میں ہے:۔

ملائکۃ اللیل تعقب ملائکۃ النھار،[1]	رات کے فرشتے دن کے فرشتوں کے بعد (باری باری) آتے ہیں،

[1] جلد سوم ص ۲۳۱ و ۲۳۲،

امام بغوی نے مترادف اور قریب المعنی الفاظ کے دقیق فرق کی بھی نشاندہی کی ہے جیسے:۔ خشوع و خضوع کے معنی قریب قریب یکساں ہیں لیکن خضوع کا تعلق صرف بدن سے ہے، مگر خشوع کا بدن، نگاہ اور آواز سے بھی ہے، قرآن مجید میں ہے:۔

وخشعت الاصوات للرحمٰن[1]	اور صدائے رحمٰن کے حضور آوازیں
(طٰہٰ - ۱۰۸)	پست ہو جائیں گی،

غم اور حزن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"بعض لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کرتے، حالانکہ حزن (غم) گذشتہ چیز پر ہوتا، اور ہم (اندیشہ) آیندہ اور متوقع چیز کے بارہ میں ہوتا ہے"

(جلد پنجم ص ۱۵۶)

مردوں کے نوحہ کی ممانعت سے متعلق حدیث میں تین مترادف الفاظ آئے ہیں صالقہ، حالقہ، اور شاقہ، ان تینوں کا فرق ملاحظہ ہو:۔

"صالقہ اس عورت کو کہیں گے جو چیخ چیخ کر روئے، اور نوحہ کرے، یہ لفظ سین سے بھی آتا ہے:۔

سلقوکم بالسنۃ حداد	وہ (منافقین) تم سے دلخراش باتیں
(احزاب - ۱۹)	کرتے ہیں،

یعنی تمہاری دلآزاری کی باتیں کھلم کھلا اور علی الاعلان کہتے ہیں صلق اصل میں تیز اور بلند آواز کو کہتے ہیں، صالقہ سے وہ عورت بھی مراد ہو سکتی ہے، جو رونے دھونے میں اپنے گالوں پر طمانچے مارتی ہو،

[1] شرح السنۃ جلد سوم، ص ۲۹۵

"حالقہ وہ عورت جو اظہارِ غم کیلئے اپنے بال منڈا دے، اور شاقہ، کپڑے، اور جیب و گریبان چاک کرنے والی عورت کو کہتے ہیں"۔

(جلد پنجم ص ۴۳۸)

طبع کے معنی تحریر کرتے ہوئے اس کے بعض ہم معنی الفاظ کا فرق واضح کرتے ہیں:۔

"طَبْعٌ، ختم (مہر لگانا) کو کہتے ہیں، اسی سے طابع کا لفظ بنا ہے، جو خاتم (انگوٹھی) کے معنی میں ہے، اور طَبَعٌ" اس زنگ اور میل کو بھی کہتے ہیں، جو تلوار میں لگ جاتی ہے، یہیں سے گناہ اور قبیح کے معنی میں بھی یہ بولا جاتا ہے، مجاہدؒ کا قول ہے کہ رَیْن طبع سے اور طبع اَقفال سے کمتر درجہ کی چیز ہے یعنی اقفال کے لفظ میں سب سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنے سے یہ فرق واضح ہو جاتا ہے؛

۱۔ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوبِہِمْ مَا کَانُوا یَکْسِبُوْنَ،	ہرگز نہیں، بلکہ اُن کے دلوں پر اُن کے اعمال کی سیاہی جم گئی ہے،
(مُطَفِّفِیْن-۱۴)	
۲۔ وطبع اللہ علٰی قُلُوبِھم،	اور اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے،
(توبہ-۹۳)	
۳۔ ام علٰی قُلُوبٍ اَقفالُھا[۱]	یا اُن کے دلوں پر تالے چڑھے ہیں،
(محمد-۲۴)	

محاورے اور اسالیبِ کلام اسی ضمن میں محاوروں اور اسالیبِ کلام سے متعلق بعض بحثیں بھی قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

[۱] شرح السنۃ ج ۴ ص ۲۱۴،

فاخذنی ما قرب وما بعد،	(مجھکو قریب بعید نے دھر لیا)

کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہ محاورہ اس موقع پر بولتے ہیں جب کسی شخص کو کسی چیز نے تشویش و اضطراب اور غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا ہو، ما قرب وما بعد کی جگہ ما قدم وما حدث کی بھی روایت ہے، اور بعض اہل عرب ایسے موقع پر فاخذنی المقیم والمقعد بولتے ہیں، ان سب کا ایک ہی مفہوم ہے، کہ اس نئے حادثہ نے جو اس وقت پیش آیا ہے، میرے گذشتہ غموں کو تازہ اور پچھلے ترددات کو لوٹا دیا، امام خطابی اس کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ میرے سارے قدیم غم عود کر آئے ہیں اور وہ اس نئے اور تازہ غم سے متصل ہو گئے۔" (ج ۳ ص ۲۳۵)

ایک حدیث میں تلاوت قرآن کرنے والے کے ساتھ قیامت کے روز اعزاز و اکرام کا معاملہ کئے جانے کا ذکر ہے، اسی ضمن میں ہے کہ

فیعطی الملک بیمینہ والخلد بشمالہ،	اس قاری کے داہیں ہاتھ میں ملک اور بائیں میں خلد عطا کیا جائے گا،

امام بغوی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:۔

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعۃً اس کے ہاتھوں میں کوئی چیز رکھی جائے گی، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قاری کو یہ سب عطا کیا جائے گا، اور وہ اس کے قبضہ و تصرف میں کر دی جائیں گی، یہ دراصل ایک اسلوب بیان ہے، کہ اگر کسی شخص کو کوئی چیز دی جاتی ہے، اور وہ اس کی ملکیت اور تصرف میں آ جاتی ہے تو گویا وہ اس کے ہاتھ میں ہو جاتی ہے، چنانچہ کہتے ہیں ھُوَ فی یدک وکفک (وہ تمھارے

ہاتھ اور مٹھی میں ہے، یعنی وہ تمہارے قبضہ و اختیار میں ہے اور تم اس کے مالک ہو"

(شرح السنۃ جلد ۴ ص ۱۵۵)

قبرستان میں جانے والے کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہنے کی تلقین کی ہے:۔

السلام علیکم اہل الدیار — اے قبروں کے رہنے والے مومنو! اور مسلمانو!

من المومنین والمسلمین و — تم پر سلامتی ہو، اور ہم بھی انشاء

انا ان شاء اللہ بکم لاحقون — اللہ تم لوگوں سے ضرور ملنے والے ہیں

اس میں زبان کے دو خاص استعمالات ہیں، ان کی وضاحت میں لکھتے ہیں:۔

"مردوں پر سلامتی بھیجنے کے وقت پہلے دعائیہ کلمہ لایا جاتا ہے، اور اس شخص کا ذکر بعد میں کیا جاتا ہے جس کے لئے سلامتی کی دعا کی جاتی ہے، یہ زبان کا عام قاعدہ ہے، کہ دعائے خیر کے موقع پر پہلے دعا کو لایا جاتا ہے، اللہ کا ارشاد ہے:۔

رحمۃ اللہ و برکاتہ علیکم — اے اہل بیت تم پر اللہ کی رحمت

اہل البیت، (ہود-۷۳) — اور برکت ہو،

دوسری جگہ ہے:۔

سلام علی ال یاسین. — الیاس پر سلامتی ہو،

(صافات-۱۳۰)

لیکن بد دعا کے موقع پر بد دعا کا لفظ موخر کر دیا جاتا ہے، اور پہلے اس شخص کا ذکر کیا جاتا ہے جس کے لئے بد دعا کی جاتی ہے:۔

شیطان کے متعلق کہا گیا ہے:۔

وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ — اور بے شک روز جزا تک تجھ پر میری پھٹکار رہیگی،

(ص-۷۸)

انشاء اللہ میں استثناء سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں شک کا مفہوم پایا جاتا ہے، بلکہ متکلم عادتاً اپنے کلام کی تحسین و تزئین کے لئے ایسا کہتا ہے، جیسے ایک شخص اپنے ساتھی سے کہتا ہے:۔

انک ان احسنت الی شکرتک — بے شک اگر تم مجھ پر احسان کروگے

انشاء اللہ وان ائتمنتنی لم اخنک — تو انشاء اللہ میں تمہارا شکرگزار

ان شاء اللہ، — ہوں گا، اور اگر تم نے مجھکو امین بنایا تو انشاء اللہ میں تمہارے ساتھ خیانت نہ کروں گا۔

روایت بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ انشاء اللہ کا استعمال ہر موقع پر مستحب ہے، خواہ معاملہ مشتبہ اور مشکوک نہ بھی ہو، حضرت اسماعیلؑ کی زبانی قرآن نے نقل کیا ہے،

سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ، (صافات-۱۰۲) — انشاء اللہ آپ مجھ کو ثابت قدموں میں پائیں گے،

حضرت یوسفؑ کے قصہ میں ہے،

ادخلوا مصر انشاء اللہ آمنین: (یوسف-۹۹) — مصر میں انشاء اللہ اطمینان سے داخل ہو جاؤ،

خود اللہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے:۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ — انشاء اللہ تم لوگ اطمینان سے

اِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ (فتح - ۲۷)

مسجد حرام میں داخل ہوگے،

ایک جگہ اللہ نے آپ کو تلقین کی ہے کہ:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ
ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ
(کہف - ۲۳ و ۲۴)

اور تم کسی چیز کے بارہ میں یہ نہ کہو کہ
کل میں اس کو کردوں گا، مگر بایں
طور کہ اگر اللہ نے چاہا (انشاء اللہ)
کروں گا،

بعض شارحین کا خیال ہے کہ حدیث میں انشاء اللہ کا تعلق لاحقون (ملنے) سے نہیں ہے، بلکہ ایمان سے ہے، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ "ہم بھی انشاء اللہ ایمان سے وابستگی کی حالت میں تم لوگوں سے ملیں گے" (جلد ۵ ص ۴۶۴ تا ۴۷۱)

بعض جگہ کلام میں حذف اور تقدیم و تاخیر اور بلاغت و بیان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی اور اس سلسلہ میں کلام عرب سے شواہد بھی پیش کئے ہیں، مگر طوالت کے خوف سے بحث نہیں ختم کی جاتی ہے۔

نحوی و صرفی مسائل

شرح السنۃ میں نحوی و صرفی مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے، اُن کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

آمین سے متعلق ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

اذا امن الامام فامنوا فانه من
وافق امینه تامین الملائکة
غفرله ما تقدم من ذنبه،

جب امام آمین کہے تو تم لوگ بھی
آمین کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا ملائکہ
کے آمین کہنے کے موافق ہوتا ہے اس
کے سابقہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں،

امام بغوی اس حدیث کے ضمن میں ایک نحوی نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں جو یہ ہے کہ "فانه من وافق الخ" کا عطف ایک محذوف پر ہے، جو ملائکہ کے آمین کی خبر ہے، اس کی تصریح ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

اذا امن القاری فامنوا فان
الملائکة تومن فمن وافق
تامینه تامین الملائکة غفرله
ما تقدم من ذنبه،

جب نماز پڑھانے والا آمین کہے
تو تم لوگ بھی آمین کہو، کیونکہ ملائکہ
بھی آمین کہتے ہیں، سو جس کا آمین
کہنا ملائکہ کے آمین کہنے کے موافق
ہوتا ہے اس کے سابقہ گناہ معاف
کردیئے جاتے ہیں،

صلاۃ وسطیٰ کے بیان میں مندرجہ ذیل آیت نقل کرکے لکھتے ہیں:۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ
الْوُسْطٰى، (بقرہ - ۲۳۸)

نمازوں کی نگہداشت رکھو خاص طور
پر بیچ کی نماز کی،

والصلاۃ الوسطیٰ میں واؤ تخصیص و تفضیل کے لئے لایا گیا ہے، یہ واؤ عاطفہ نہیں ہے، دوسری جگہ ہے:

من کان عدوا لله وملائکته
ورسله وجبریل ومیکائل،
(بقرہ - ۹۸)

جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے
رسولوں اور جبریل و میکائیل کے دشمن
ہوئے،

جبریل و میکائیل بھی ملائکہ میں شامل ہیں لیکن خصوصیت کی بنا پر ان کا پھر علحدہ اور مستقل ذکر کیا گیا ہے، ایک اور جگہ ہے:۔

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ، ان دونوں (باغوں) میں میوے اور
(جلد ۲ ص ۲۳۲) کھجور اور انار ہوں گے،

صرفی بحثوں میں الفاظ کے مشتقات وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، مثال کے طور پر ایک بحث کا خلاصہ دیا جاتا ہے، وہ لفظ "اسم" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"بعض لوگوں نے اس کو وسم اور سمۃ سے مشتق بتایا ہے، جس کے معنی علامت کے ہیں، گویا اسماء اپنے مسمیات کی علامتیں اور نشانات ہوتے ہیں، اور اُن کے ذریعہ ایک چیز دوسری چیز سے ممیز اور ممتاز ہو کر جان پہچان لی جاتی ہے، مگر اکثر علمائے نحو نے اس کو سمو سے مشتق مانا ہے، جو علو (بلند ہونا) کے معنی میں ہے، اس صورت میں بات یوں ہوگی کہ گویا اسم اپنے معنی پر بلند و بالا اور غالب ہو گیا، اور اس کا معنی اس کے نیچے ہو گیا، یہی قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اسم کی تصغیر سُمَیّ آتی ہے اور اگر یہ سِمَۃ اور وسم سے مشتق ہوتا تو تصغیر وُسَیم آتی جیسا کہ اس کے ہم وزن وَعْدٌ وَعِدَۃٌ کی تصغیر وُعَید آتی ہے، اور اس کا صیغہ سمیت وغیرہ آتا ہے، حالانکہ اگر یہ وسم سے بنا ہوتا تو وسمت کہا جاتا، اس کی جمع اسماء ہے،" (جلد ۵ ص ۲۹ و ۳۰)

مصنف نے حدیث کی جو فنی بحثیں کی ہیں وہ بڑی محققانہ ہیں، ان میں اصولِ حدیث کے مباحث، رواۃ اور روایت کی قوت وصحت یا ضعف و وہن، اور جرح و تعدیل کے متعلق اقوال نقل کر کے روایت کے درجہ و مرتبہ کو متعین کیا گیا ہے، مگر اس قسم کی خالص فنی بحثوں سے اردو خواں طبقہ کو دلچسپی نہ ہوگی، اس لئے انھیں قلم انداز کیا جاتا ہے،

شرح السنۃ سے امام بغوی کی وسعتِ علم و نظر کا پورا اندازہ ہوتا ہے، وہ اپنے زمانہ کی متداول اور مروّج کتابوں پر مکمل نظر رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے لغات کے حل میں بلند پایہ

اہلِ لغت اور عربیت کے ماہرین کے اقوال، کلام مجید اور عربی زبان کے شواہد و اسالیب نقل کئے ہیں، احادیث کی اہم شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے، اور مشہور شارحین کے اقوال اکثر ذکر کئے ہیں، فقہ و خلاف کے مباحث میں صحابہ و تابعین کے مسالک اور ائمہ فقہ و مجتہدین کی رائیں تحریر کی ہیں، اور تفسیری اقوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو کبار ائمہ تفسیر کے تفسیری اقوال بیان کرتے ہیں،

مقدمہ وحواشی فاضل مرتبین شعیب ارناؤوطا اور زہیر الشاویش کے مقدمہ میں شرح کی اہمیت وخصوصیت، تصنیف کا مقصد اور اس کے چھ قلمی نسخوں کے بارہ میں ضروری مفید معلومات، امام بغوی کے مختصر حالات و کمالات...... اور مخطوطہ نسخوں کا عکس دیا گیا ہے، متن کی تصحیح میں مخطوطہ نسخوں کے علاوہ حدیث و سیر اور طبقات و رجال کی مختلف کتابوں سے مدد لی گئی ہے، اور حاشیہ میں نسخوں کے فرق و اختلاف کی تصریح، رجال کے تراجم، احادیث کی قوت وضعف، اسماء و لغات کی تحقیق اور آیتوں اور حدیثوں کی تخریج کر کے اُن کے مفصل حوالے دیئے گئے ہیں، مصنف کی مختصر تشریحات اور مبہم بیانات کی تفصیل و توضیح، اور کہیں کہیں ان کی رایوں سے اختلاف بھی کیا گیا ہے،

تذکرۃ المحدثین

(جلد اوّل)

صحاح ستہ کے جلیل القدر مصنفین کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی کے اوائل تک کے تمام مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام مالک صاحبِ موطا، امام عبد الرزاق، امام دارمی، امام ابن جارود، امام ابن حنبل، امام حمیدی، امام ابن خزیمہ وغیرہ کے حالات و سوانح اور اُن کی خدمات حدیث کی تفصیل، مع مقدمہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم،

مولفہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی، قیمت: ۱۱ روپیے، اس کی دوسری جلد زیر طبع ہے، "منیجر"

جامع مسجد برہان پور کے کتبات

فتح اسیر گڈھ کا کتبہ

سلسلہ کے لیے دیکھئے معارف ستمبر ۱۹۷۴ء

از جناب مولوی معین الدین صاحب استاد اردو و فارسی سیواسدن کالج برہانپور

جامع مسجد برہانپور کا فاروقی دور کا دوسرا کتبہ منبر کے پاس کی وسطی محراب پر ہے، جس کا ذکر انشاء اللہ آیندہ کسی اشاعت میں ہوگا، اس مسجد کا تیسرا کتبہ دورِ مغلیہ کا ہے جو جنوبی مینار کے زیریں حصہ پر ہے، اسکی زبان فارسی اور خط نستعلیق ہے، کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے :-

(۱) "تاریخ الٰہی عبادت است از زمانِ جلوس حضرت شہنشاہ ظلِ الٰہ اکبر، بادشاہ شاہ اکبر کہ زتائید جوان بخت

(۲) خویش قلعۂ اسیر کشاد۔ گشت آباد اسیر از ان نامی :. سنہ بیش گفت الہ آباد

(۳) بتاریخ ۲۱ر فروردین ماہ الٰہی ۴۵ سنہ موافق رمضان ۱۰۰۹ھ حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ ظل الٰہ برہانپور را

(۴) مقرِ رایات ظفر آیات ساختند و بہادر خاں آمدہ بپابوس مشرف شد و او را باتباع جاں بخشی کردند و قلعۂ اسیر فتح شد۔

(۵) شاہِ غازی جلالِ دیں اکبر ۔۔۔ آں بتائیدِ بخت قلعہ کشا

کرد فتح اسیر از ان نامی ۔۔۔ گفت بگرفت قلعۂ اعلا

(۶) قائلہ و کاتبہ محمد معصوم المتخلص بنامی ابن سید صفائی الترمذی اصلاً والبکری مسکناً و مدفناً

(۷) والمنتسب امًّا الی سید شیر قلندر ابن بابا حسن ابدال السبزواری مولداً والقندھاری موطناً و مقبرۃً

(۸) بتاریخ دوازدہم اردی بہشت ۴۶ سنہ موافق ۲۶ر شوال ۱۰۰۹ھ بندگان حضرت عازم لاہور شدند

(۹) فتح خاندیس و دکن چوں کرد شاہ ۔۔۔ عازمِ ہندوستاں فی الفور شد

یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت ۔۔۔ شاہِ والا عازمِ لاہور شد

ترجمہ :- (۱) تاریخ الٰہی سے مراد حضرت شہنشاہ، بزرگ ترین خدا کے سایہ، بادشاہ شاہِ اکبر کا زمانۂ جلوس مراد ہے جنھوں نے

(۲) اپنی جوان قسمت کی حمایت سے قلعۂ اسیر فتح کیا۔ (شعر) اسیر آباد ہوگیا اس لیئے نامی نے ایک عدد کا اضافہ کرکے (اس کا تاریخی مادہ) الہ آباد کہا۔

(۳) بتاریخ ۲۱ ماہِ فروردیں ۴۵ سنہ الٰہی مطابق (۲۴) رمضان ۱۰۰۹ھ حضرت شہنشاہ فلک بارگاہ، سایۂ خدا نے برہانپور کو

(۴) اپنے ظفر نشان جھنڈوں کا مستقر بنایا (برہانپور کا بادشاہ) بہادر خان اگر قدمبوسی سے مشرف ہوا، اسکی اور اس کے ماتحتوں کی جاں بخشی کی گئی اور قلعۂ اسیر فتح ہوگیا۔

(۵) شاہِ غازی جلال الدین اکبر نے قلعہ فتح کرنے والی اپنی قسمت کے زور سے اسیر کو فتح کر لیا، اس لیے نامی نے (اس کا تاریخی مادہ) بگرفت قلعۂ اعلیٰ (نہایت بلند قلعہ فتح کیا) کہا

(۶) اس کتبہ کا قائل و کاتب محمد معصوم المتخلص بہ نامی سید صفائی کا فرزند ہے جو در اصل شہر ترمذ کے باشندے تھے۔ اور جنھوں نے بھکر (علاقہ سندھ) میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں وہ دفن بھی ہوئے۔

(۷) اور والدہ کی طرف سے اس کا نسب سید شیر قلندر ابن بابا حسن ابدال سے ہے۔

جن کا مولد سبزوار اور وطن قندھار تھا اور اسی قندھار میں ان کا مزار بھی ہے۔

(۸) بتاریخ ۱۲ اردی بہشت سنہ ۴۶ھ (الٰہی) مطابق ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ (ہجری) بادشاہ سلامت نے لاہور کا قصد کیا۔

(۹) (قطعہ) جب بادشاہ نے خاندیس و دکن کو فتح کیا تو فوراً ہندوستان کا قصد کیا۔ نامی نے ایک عدد کا اضافہ کر کے (تاریخی مادہ) "شاہ والا عازم لاہور شد"۔ (شاہ والا عازم لاہور ہوئے) کہا

کتبہ پر تبصرہ اس کتبہ میں تین تاریخی مادے ہیں (۱) "الہ آباد" (۲) "بگرفت قلعۂ اعلا" (۳) "شاہ والا عازم لاہور شد"۔ پہلے دو مادے فتح اسیر کے ہیں اور تیسرے مادے میں اکبر کی تاریخ مراجعت ہے۔

فتح اسیر کے پہلے مادہ "الہ آباد" سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی، چنانچہ آر۔ پی ہیرالال نے اس کا یہ مطلب لیا کہ شہنشاہ اکبر الہ آباد کے راستے برہان پور آیا تھا[1]، حالانکہ کتبہ میں الہ آباد سے کوئی مخصوص شہر مراد نہیں ہے بلکہ وہ اپنے لغوی معنے میں مستعمل ہوا ہے۔ اسی طرح مسٹر صبور نے اس کتبہ کے خلاصہ میں تحریر کیا ہے کہ شہنشاہ اکبر برہان پور پر قبضہ کرنے کے لیے اکبر آباد (آگرہ) سے آیا تھا[2]، حالانکہ کتبہ میں اکبر آباد کا کہیں ذکر نہیں ہے، غالباً موصوف نے غلطی سے الہ آباد کو اکبر آباد پڑھ کر یہ رائے قائم کی۔

محمد معصوم نے الہ آباد سے فتح اسیر کی تاریخ اکبر کے سنہ جلوس میں نکالی ہے، اسیر گڈھ سنہ ۴۵ جلوس میں فتح ہوا تھا، اور الہ آباد کے عدد ۴۴ ہوتے ہیں، اس لیے موصوف نے ایک عدد کا اضافہ کر کے ۴۴ کو ۴۵ بنا دیا اور "سنہ بیش گفت" کے الفاظ سے اس اضافہ کی طرف اشارہ بھی کر دیا، اب سوال یہ ہے کہ نامی نے فتح اسیر کے مادۂ تاریخ کے لیے "الہ آباد" کا انتخاب کیوں کیا، جبکہ اس سے فتح کا صحیح سنہ بھی نہیں نکلتا اور اس کے معنی بھی فتح اسیر پر دلالت کرنے کے

---

[1] Descriptive List of Inscriptions in C.P. & Berar. Nagpur.
[2] E.I.P.S. for 1961

بجائے غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پُر تکلف انتخاب محض اکبر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا گیا، کیونکہ اکبر اپنے آپ کو شانِ الٰہی کا مظہر بلکہ ہندوانہ اصطلاح میں خدا کا اوتار سمجھتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والی مخصوص اشیاء کا جزو خاص لفظ الٰہی تھا، مثلاً اس کا ایجاد کردہ مذہب دینِ الٰہی، رائج کردہ گز گزِ الٰہی، جاری کردہ سنہ سنہِ الٰہی اور حاجیوں کو لانے لیجانے والا سرکاری جہاز جہازِ الٰہی کہلاتا تھا، اکبر نے ایک مرتبہ اپنی اسی شانِ الوہیت کی تشہیر کے لیے حکم دیا تھا کہ میری مہر کا سجع "اللہ اکبر" کہیں، چونکہ اس جملہ سے اکبر میں شانِ الوہیت کا شبہہ ہوتا تھا، اس لیے حاجی ابراہیم سرہندی نے مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اس میں شبہہ پڑتا ہے اس لیے "وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَر" (اور البتہ اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے) کہیں تو بہتر ہے[1]، مگر حاجی صاحب موصوف کی ایک نہ چلی اور اکبر کی خواہش کے مطابق مہر پر "اللہ اکبر" کندہ ہو کر رہا، عہد اکبری کے منصب دار سلام کرتے وقت السلام علیکم کے بجائے اللہ اکبر اور وعلیکم السلام کے بجائے جل جلالہ کہا کرتے تھے، اللہ اکبر سے اللہ کی کبریائی اور جل جلالہ سے اس کی عظمت و جلال کا اظہار کیا جاتا ہے، لیکن ان جملوں میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اکبر شہنشاہ کا لقب اور جلال الدین اس کا نام تھا، اسی مناسبت سے عہد اکبری کے امراء اکبر میں شانِ الوہیت کا اعتراف کر کے اس کی عظمت و جلال کا اظہار کرتے تھے، بہرحال جب اسیر گڈھ فتح ہو کر اکبر کے زیر سایہ آیا اور بقول نامی اکبر کے ذریعہ آباد ہو گیا تو اس کے لیے موزوں لفظ اکبر آباد تھا، لیکن چونکہ نامی اکبر کو شانِ الٰہی کا مظہر سمجھتا تھا، اس لیے اس نے الہ آباد کو اکبر آباد کا مرادف مان کر اس سے فتحِ اسیر کی تاریخ نکالی، اگرچہ اس میں ایک عدد کی کمی رہ گئی۔

فتحِ اسیر کا دوسرا تاریخی مادہ "بگرفت قلعۂ اعلا" ہے، جس سے ۱۰۰۹ھ برآمد ہوتا ہے،

---

[1] دربار اکبری تقطیع خورد ص ۵۲۔

اس مادہ میں اسیر گڈھ کو نہایت بلند قلعہ مانا گیا ہے، اس کی بلندی کا اندازہ ۸۷۶ھ کے اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب والی برہان پور عینا عادل خاں فاروقی کے عہد حکومت میں مالوہ کا بادشاہ محمود خلجی تسخیر اسیر گڈھ کے ارادہ سے لشکر سمیت دامنِ قلعہ میں فروکش تھا، اس نے ایک رات بیدار ہو کر قلعہ کی طرف نظر کی تو خادم کو آواز دے کر کہا کہ صبح کا ستارہ طلوع ہو گیا ہے، وضو کے لیے پانی لاؤ، خادم نے عرض کی کہ حضور! آپ جسے صبح کا ستارہ سمجھ رہے ہیں وہ اسیر گڈھ کے برج کا چراغ ہے، بادشاہ نے حیران ہو کر گردن جھکائی اور کچھ دیر سوچ کر کہا کہ جو پہاڑی قلعہ اتنی بلندی پر واقع ہے کہ اس کے برج کا چراغ آسمان کا ستارہ معلوم ہوتا ہے، اسے فتح کرنا ناممکن ہے، چنانچہ وہ "این الثریا من ید المتناول" (ثریا تک کس کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے) کہہ کر لشکر سمیت واپس ہو گیا۔[1] سلطان محمود خلجی کی طرح نامی نے بھی قلعۂ اسیر کے نہایت بلند اور ناقابل تسخیر ہونے کا اعتراف اپنے اس کتبہ کے آغاز میں کیا ہے، جو اسیر گڈھ کی اس طویل و بلند چٹان پر کندہ ہے، جس پر اس کے علاوہ اور بھی تین کتبے موجود ہیں۔ اس کتبہ کی عبارت یہ ہے:۔

(۱) قلعۂ اسیر کہ با کرۂ اثیر ہمسر است و از زمانِ بنا تا امروز دست

(۲) تصرف از دیں کوتاہ بود، بتاریخ ۴۵ سنہ موافق ۱۰۰۸ھ بر دستِ

(۳) شہنشاہ ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ مفتوح شد

(۴) کرد از تائید لطفِ ایزدی فتح اسیر	شاہ ہفت اقلیم عالمگیر اکبر بادشاہ
(۵) نامیا داد الٰہی داد ش ایں فتحِ عظیم	سالِ تاریخِ الٰہی خواہ از داد الٰہ

(۶) قائلہ کاتبہ محمد معصوم بکری۔

اس کتبہ میں بھی قلعۂ اسیر کو بلندی میں کرۂ فلک کا ہمسر مان کر اس کے ناقابل تسخیر ہونے کا

[1] ظفر الوالہ جلد اول ص ۴۵ - ذکر عینا عادل خاں فاروقی۔

اعتراف کیا گیا ہے، اور "داد الٰہ" سے اکبر کے سنہ جلوس میں فتح اسیر کی تاریخ (۴۵ سنہ) نکالی گئی ہے۔

اس کتبہ کا تیسرا تاریخی مادہ "شاہ والا عازم لاہور شد" برہان پور سے اکبر کی روانگی کا سنہ ظاہر کرتا ہے۔ اکبر ۱۰۰۹ھ میں روانہ ہوا تھا، لیکن مذکورہ عبارت کے عدد ۱۰۰۸ ہوتے ہیں، اس لیے نامی نے "یک عدد نامی فزود" کے الفاظ سے ایک عدد کے اضافہ کا اشارہ کر کے ۱۰۰۸ کو ۱۰۰۹ بنا دیا، اس کتبہ کے جس قلعہ میں اکبر کی مراجعت کا ذکر ہے وہ قطعہ نامی کے معمولی فرق کے ساتھ تین مختلف مقامات پر کندہ کیا ہے، جامع مسجد برہان پور کے جنوبی مینار پر، اسیر گڈھ کی اس چٹان پر جس پر نامی کا مذکورۂ بالا کتبہ بھی موجود ہے، اور اجین کے قریب کالیادیہ گاؤں میں سپرا ندی کے کنارے کی ایک عمارت پر۔ جامع مسجد برہانپور کے مینار پر قطعۂ مذکور کی عبارت یہ ہے ؎

فتحِ خاندیس و دکن چوں کرد شاہ	عازم ہندوستاں فی الفور شد
یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت	شاہ والا عازم لاہور شد

یہی قطعہ اسیر گڈھ کی مذکورہ چٹان کے کتبہ میں اس فرق کے ساتھ موجود ہے کہ اس کے پہلے شعر کے مصرعِ اول میں خاندیس کے بجائے داندیس تحریر ہے، کیونکہ اکبر نے قلعۂ اسیر فتح کرنے کے بعد شہزادہ دانیال کو خاندیس کا صوبہ دار بنا کر اس کے نام پر خاندیس کا نام داندیس یعنی دانیال دیس رکھ دیا تھا۔[1] قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے اس کتبہ کی پوری عبارت درج ذیل ہے:۔

(۱) بندگانِ حضرت ظلِ الٰہ ملک دکن و

(۲) داندیس را بحضرت قدسی القاب

(۳) شاہزادۂ دانیال تفویض فرمودہ

[1] دربار اکبری تقطیع خورد ص ۱۰۰

(۴) ۱۳ اردی بہشت ۴۶ سنہ موافق ۲۶

(۵) شوال ۱۰۰۹ سنہ عازم ہند شدند۔ المحررہ

(۶) فتح داندیس و دکن چوں کرد شاہ

(۷) عازم ہندوستان فی الفور شد

(۸) یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت

(۹) شاہِ والا عازم لاہور شد

کالیادیہ اُجّین سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے، جہاں برہانپور سے لاہور جاتے ہوئے شہنشاہ اکبر نے مقام کیا تھا، اسی گاؤں میں سپرا ندی کے کنارے ایک عمارت پر محمد معصوم نامی کا ایک کتبہ[1] نصب ہے، اس میں بھی وہی قطعہ موجود ہے، لیکن اس کے شعرِ اول کا مصرعِ دوم بالکل بدلا ہوا ہے، اس کتبہ کی پوری عبارت حسبِ ذیل ہے۔

(۱) بتاریخ ۴۵ سنہ الٰہی موافق ۱۰۰۹ سنہ حضرت خلافت پناہ

(۲) ظل الٰہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ مالکِ دکن و خاندیس را

(۳) (بشاہزادۂ دانیال) تفویض نمودہ مراجعت نمودند۔ المحررہ

(۴) فتح خاندیس و دکن چوں کرد شاہ عازم نزہت گہِ معمور شد

(۵) یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت شاہِ والا عازم لاہور شد

اس کتبہ کی تیسری سطر کے ابتدائی الفاظ محو ہوگئے ہیں لیکن سیاقِ عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں "بشاہزادۂ دانیال" کے سوا کوئی عبارت نہیں ہوسکتی، اسیر گڈھ کے اس مضمون کے کتبہ میں بھی اس موقع پر یہی الفاظ آئے ہیں۔

---

[1] Epigraphia Indo Moslemica 1933-34 ء

برہانپور و اسیر گڈھ کے کتبوں کے مذکورہ قطعہ کی عبارت "عازم ہندوستان فی الفور شد" میں "فی الفور" کا لفظ معنی خیز ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا تشویشناک واقعہ پیش آیا کہ اکبر فوری مراجعت کے لیے مجبور ہوگیا، وہ واقعہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی بغاوت کا تھا، شہزادہ نے خیال کیا کہ شہنشاہ اکبر کئی ماہ سے سینکڑوں میل دور اسیر گڈھ کی مہم میں بری طرح الجھا ہوا ہے، اور شہزادہ دانیال بھی کالے کوسوں دور احمد نگر کی جنگ میں مصروف ہے، اس وقت شمالی ہند کا میدان بالکل خالی ہے، لہٰذا تختِ سلطنت پر قبضہ کرنے کا یہی بہترین موقع ہے، چنانچہ اس نے اودھ، بہار وغیرہ صوبوں پر قبضہ کرکے شاہی منصبداروں کو معزول کیا، ان کی جاگیریں ضبط کیں، ہر جگہ اپنے حاکم مقرر کیے، اور اپنے مصاحبوں کو منصب خطاب اور جاگیریں دیکر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، اکبر کو جب برہانپور میں یہ خبر ملی تو وہ پریشانی کے عالم میں فوراً روانہ ہوگیا، لیکن براہ راست آگرہ نہ جاکر لاہور گیا تاکہ شاہزادہ سے تصادم کا موقع نہ آئے، اور وہ اسے جنگ کے بجائے حسنِ تدبیر سے راہ راست پر لاسکے، کتبہ کا لفظ "فی الفور" اسی واقعہ کی غمازی کر رہا ہے۔

برہانپور و اسیر گڈھ کے کتبوں کے مذکورہ قطعہ کے پہلے شعر سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگرچہ کشمیر سے راس کماری تک کا پورا ملک ہندوستان ہے لیکن اس زمانہ میں خاندیس و دکن کا شمار ہندوستان میں نہیں ہوتا تھا، زمانۂ حال میں بھی اہلِ دکن ہندوستان سے شمالی ہند مراد لیتے ہیں، فانی مرحوم کے مندرجۂ ذیل شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ؎

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ان تینوں کتبوں میں فتح دکن کا ذکر ہے، دکن ہمارے ملک کا بہت بڑا حصہ ہے جس میں اس زمانہ میں کئی سلطنتیں موجود تھیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اکبر نے ان

سب کو فتح کر لیا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس کتبہ میں فتح دکن سے صرف تسخیر احمد نگر مراد ہے، جس کی تصدیق ۱۰ ہی کے اس کتبہ سے ہوتی ہے، جو برہانپور کے شاہی قبرستان کے مشرقی روضہ کی مغربی دیوار پر کندہ ہے، یہ کتبہ دس سطروں پر مشتمل ہو جس کی ساتویں اور آٹھویں سطر میں قلعۂ اسیر و احمد نگر کی فتح کا ذکر ہے، ابتدائی چھ سطروں کا مضمون عبرت آموز ہے، کیونکہ کتبہ تحریر کرتے وقت ناہی کے پیش نظر شاہی قبرستان کا وہی حسرتناک منظر تھا جس کی عکاسی شاعر ملت ڈاکٹر اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار[1] میں کی گئی ہے،

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا — دیدۂ عبرت خراجِ اشکِ گل گوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہو — آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہو
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اسقدر — جنبشِ مژگاں سے ہو چشم تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں — جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں
سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور — مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل — جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری — ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

کتبہ کی پوری عبارت حسب ذیل ہے:-

۱- انظروا الی اہل القبور فاعتبروا یا اولی الابصار
۲- لما قیل غفلة الاحیاء اکثرام حسرة الاموات
۳- قال عیسیٰ عم الدنیا قنطرة فاعبروہا ولا تعمروہا

[1] یہ اشعار اقبال کی نظم "گورستان" سے ماخوذ ہیں، جس میں گولکنڈہ کے شاہی قبرستان کا ذکر ہے۔

۴- فریاد و رحیل از ہمہ کس می شنوی — آواز درا ز پیش و پس می شنوی
۵- کردہ ہمہ شبگیر سر منزل دور — تو خفتہ یرہ بانگ جرس می شنوی
۶- نامی ز زمانہ بار بر داد — رو آر بآں جہان سبکبار
توخفتہ براہ و کاروان تیز — تو سنگ خودی ز راہ بر خیز
۷- در حینے کہ حضرت ظل الٰہی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ از فتح قلعۂ اسیر
۸- و احمد انگر وا پرداختہ متوجہ لاہور شدند تحریر یافت سنہ ۱۰۰۹
۹- العبد محمد معصوم بن سید صفائی اباً و البکری مرقداً و الترمذی اصلاً
۱۰- ابن سید شیر بن بابا حسن ابدال اماً و القندھاری مشہداً و السبزواری موطناً۔

واضح رہے کہ اس کتبہ میں عوامی لہجہ کی پیروی کرتے ہوئے احمد نگر کو احمد انگر تحریر کیا گیا ہے، زمانۂ حال میں بھی جنوبی ہند کے عوام اسے امدا نگر یا احمد انگر ہی کہتے ہیں، عبد الرحیم صاحب نے آر۔ بی وہائٹ ہیڈ کی کتاب[1] کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر کے جو سکے احمد نگر کی ٹکسال میں ڈھلے ہیں ان پر بھی "احمد انگر" درج ہے۔

آیئے اب کتبہ کے اس مضمون پر غور کریں جس میں اکبر کی آمد و مراجعت، بہادر خاں کی حاضری اور فتح اسیر گڈھ کا ذکر ہے، ابو الفضل نے اکبر کے ورود برہان پور کی تاریخ ۲۱ فروردین ۴۵ الٰہی تحریر کی ہے، اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ۴۵ الٰہی ۱۴ رمضان المبارک ۱۰۰۸ھ سے شروع ہوا تھا[2]، چونکہ سنہ الٰہی کا آغاز یکم فروردین سے ہوتا ہے اس لیے ۲۱ فروردین ۴۵ الٰہی ۲۴ رمضان ۱۰۰۸ھ کے مطابق ہی، مینار کے اس کتبہ میں ۲۱ فروردین ۴۵ الٰہی موجود ہے،

[1] Catalouge of Coins in Punjab meuseum Lahore (Oxford 1914 Page xxxvii)

[2] اکبر نامہ جلد ۳ طبع لکھنؤ ص ۵۳۰

لیکن اسلامی تاریخ "رمضان ۱۰۰۹ھ" درج ہے۔ اس طرح اس میں دو فروگذاشتیں ہو گئی ہیں یعنی کاتب رمضان کی تاریخ درج کرنا بھول گیا، اور ہجری سنہ ۱۰۰۸ کے بجائے ۱۰۰۹ تحریر کر دیا۔

اکبر کے ۱۰۰۸ھ میں وارد برہان پور ہونے کا ثبوت اکبرنامہ کے علاوہ نامی کے اس کتبے[1] سے بھی ملتا ہے جو کالیادیہ میں سپرا ندی کے کنارے کی اسی عمارت پر نصب ہے جس پر موصوف کا وہ کتبہ بھی موجود ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا۔ یہ کتبہ نامی نے اکبر کے حملہ آور لشکر کے ساتھ برہان پور آتے ہوئے کندہ کیا تھا۔ کتبہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے،

"بتاریخ ۴۴ھ سال الٰہی موافق ۱۰۰۸ھ کہ رایات ظفر آیات عازم تسخیر دکن بود اینجا عبور افتاد"

اس کے بعد ایک قطعہ اور آخر میں کاتب کا نام "محمد معصوم نامی البکری" مرقوم ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جب شہنشاہ اکبر ۱۰۰۸ھ میں کالیادیہ سے روانہ ہوا تو ۴۴ھ الٰہی قریب الختم تھا، اس لیے برہان پور پہنچنے کے ۲۰ روز پہلے ہی ۴۵ھ الٰہی شروع ہو گیا، اور وہ ۲۱ فروردین ۴۵ھ الٰہی مطابق ۲۴ رمضان ۱۰۰۸ھ میں برہان پور پہنچا۔ بقول عبدالرحیم خان خاناں "برہانپور آگرہ سے ۲۷ منزل ہے[2]"۔ اس لیے یہ مسافت ۲۷ روز میں طے ہوتی تھی، کالیادیہ اور برہانپور کا درمیانی فاصلہ اس سے کم ہے، اس لیے وہ تقریباً تین ہفتہ میں طے ہوا ہوگا، پھر چونکہ رمضان المبارک اسلامی سال کا نواں مہینہ ہے، اس لیے اگر یہ مسافت پونے نو مہینے میں بھی طے ہوئی ہو گی تب بھی کالیادیہ سے روانگی کے وقت جو ہجری سنہ ۱۰۰۸ تھا وہ برہانپور پہنچنے کے بعد ۱۰۰۸ ہی رہا ہوگا نہ کہ ۱۰۰۹۔

(باقی)

---

[1] Epigraphia Indo Moslemica 1933-34

[2] دربار اکبری ص ۲۲۷

ڈاکٹر سید محمود کا مقدمہ دیوان غالب نظامی ایڈیشن

از جناب مبشر علی صدیقی ایم اے علیگ بدایوں

میری نظر سے ابھی حال میں سید صباح الدین عبدالرحمن کی گرانقدر تصنیف "ڈاکٹر سید محمود" گذری، فاضل مصنف نے ۱۲۸ صفحات میں ڈاکٹر مرحوم کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے ہر ایک نقش سے ان کا خلوص، وابستگی اور عقیدت مندی نمایاں ہے، ڈاکٹر سید محمود کے مستقبل کے سوانح نگاروں کو اس سے بہت مدد ملے گی، اس کتاب میں سید محمود کے معرکۃ الآرا مقدمہ کے متعلق جو انھوں نے دیوانِ غالب نظامی ایڈیشن کے تیسرے ایڈیشن پر حسب فرمائش مولوی نظام الدین حسین نظامی مالک نظامی پریس بدایوں لکھا تھا، فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون نظامی بدایونی کی شرح کلام غالب کے پانچویں ایڈیشن میں بھی شامل ہے، اس پر اس مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، شیخ اکرام وغیرہ نے بڑی سخت تنقیدیں کیں اور پھر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار کو غدر کی تباہی وغیرہ سے منسوب کیا ہے، وہ غدر سے بہت پہلے لکھے جا چکے تھے، ڈاکٹر صاحب کو جب اشعار کے کہنے کا زمانہ معلوم ہوا تو پھر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کر لیا، مگر وہ غالب کی وطن پرستی کے آخر وقت تک معترف رہے، میں نے اپنی زیر تالیف کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر مفصل تبصرہ کیا ہے، اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو اشعار غالب کی وطنیت کے ثبوت میں پیش کیے ہیں، وہ تو یقیناً وطنی جذبے میں نہیں لکھے گئے، لیکن ان کے مجموعہ کلام میں بنارس، پٹنہ، کلکتہ کی جو مداحی ہے یا ان کے خطوط میں دہلی سے محبت اور لگاؤ کا اظہار ہے

یا ان کے مکتوبات اور دستنبو میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو دردناک تفصیلات ہیں یا پھر
ان کو اپنے ہندو شاگردوں اور دوستوں سے جو شیفتگی رہی اور جو موقع موقع پر اپنی رواداری
اور بے تعصبی کا ثبوت دیتے رہے، اس سے اس زمانہ کے معیار کے مطابق ان کی وطنیت، جذباتی
ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میری کتاب کا یہ حصہ اصرار
کر کے مجھ سے سنا اور سن کر فرمایا کہ جس طرف میری نظر پہلے نہیں گئی تھی تم نے منتقل کرادی،
میرے مضمون میں میرے دلائل صحیح نہ ہوں لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا وہ
صحیح تھا۔ خوش ہوں کہ میرے مضمون ہی کی بدولت غالب کے پرستار غالب کے کلام اور تصانیف
کو میری نگاہ سے بھی مطالعہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔"

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر سید محمود کا یہ کوئی معمولی مضمون نہیں ہے، بلکہ اپنی
جگہ پر ایک مستقل مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے جو دیوان غالب بدایوں ایڈیشن کے چالیس صفحات
پر محیط ہے۔ بدایوں ایڈیشن اس لیے لکھنا پڑا ہے کیونکہ نظامی پریس لکھنؤ اور نظامی پریس کانپور
نے بھی غالب کے متعدد ایڈیشن شائع کیے تھے۔ نظامی بدایونی نے یہ مقدمہ ڈاکٹر سید محمود سے
بار بار تقاضے کر کے لکھوایا تھا، کیونکہ ڈاکٹر موصوف نے ان کے شائع کیے ہوئے دیوان غالب
پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا، نیز اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہے کہ پانچواں ایڈیشن
شرح کلام غالب نہیں ہے، بلکہ مکمل اردو دیوان غالب ہے، جو مع متعدد دیباچوں اور ڈاکٹر
سید محمود کے مقدمہ اور فٹ نوٹ میں مشکل اشعار کی شرح کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، نظامی
پریس بدایوں نے دیوان غالب کے کل چھ ایڈیشن شائع کیے تھے، جن میں پاکٹ سائز ایڈیشن
اور لائبریری ایڈیشن شامل ہیں، زیر نظر مصنف کے پیش نظر غالباً پانچواں ایڈیشن ہے، جو ۱۹۲۳ء
میں شائع ہوا تھا۔ دیوان غالب کے علاوہ نظامی پریس بدایوں نے نکات غالب، مرثیۂ غالب

از حالی اور روح کلام غالب مصنفہ مرزا عزیز بیگ مرزا جیسی معیاری کتابیں بھی شائع کی تھیں۔[۵]
نظامی مرحوم اس مقدمہ کے متعلق دیوان غالب کے دیباچہ طبع ثالث (دیوان ۱۹۲۰ء میں طبع ہوا
لیکن دیباچہ کی تاریخ تحریر ۹ دسمبر ۱۹۱۹ء ہے) میں لکھتے ہیں:-

"اس جدید الطبع نسخے میں ایک قابل قدر اضافہ ڈاکٹر سید محمود صاحب غازیپوری
پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا وہ عالمانہ مقدمہ ہے جس کو انھوں نے خاکسار کی درخواست
پر لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی........ اس میں انھوں نے وہ وہ نکات پیدا کیے ہیں
جو آج تک مرزا غالب کے سوانح نگاروں یا ان کے کلام پر تنقید کرنے والوں کو نہ سوجھے تھے۔"

غالب کے اردو دیوان کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، اور ان کے اشعار کے ایک سے
زیادہ معنی و مفہوم بیان کیے گئے ہیں، ڈاکٹر محمود کا مقدمہ ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری کے
مقدمہ کے بعد لکھا گیا تھا، ڈاکٹر بجنوری کے مقدمہ کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے:

"لیکن اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے
مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنی میں پہچان لی تھی، اور جو غالب کے کلام کو ایسے حسن معنی کے
ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی اور صوفی شاعر اور سائنسداں
سب ہی متحیر رہ جاتے ہیں، آہ عبد الرحمن، عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور تو ملک و قوم
کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔" (مقدمہ از ڈاکٹر سید محمود۔ دیوان غالب
نظامی ایڈیشن طبع سوم)

اس مقدمہ میں شعر و شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اور فارسی شعرا انوری، خاقانی، عرفی
اور طالب کی غزلیات پر غالب کی فوقیت جتاتے ہوئے، انگریزی شعرا شیکسپیر اور شیلے کا ذکر
کرتے ہوئے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کا نام بھی لیا گیا ہے، اور غالب کو اس کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے،

---

[۵] راقم کا مضمون "دیوان غالب کے نظامی ایڈیشن" مطبوعہ "جامعہ" بابت ماہ جون ۱۹۷۳ء ص ۳۱۶ تا ۳۲۱ ملاحظہ ہو

غالب کی فلسفیانہ شاعری پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور آخر میں غالب کو ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ڈاکٹر سید محمود کے اس نئے نظریہ پر راس مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر عبداللطیف اور شیخ اکرام نے کافی نکتہ چینی کی کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مثال میں غالب کے جو اشعار پیش کیے ہیں، ان میں سے بیشتر ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے لکھے گئے تھے، لیکن ان کے خطوط اور دستنبو میں ان کی حب الوطنی اور انگریزوں کے جبر و استبداد کے متعلق واضح اشارات ملتے ہیں، وہ دہلی کی تباہی پر آنسو بہاتے ہیں، غدر کے بعد دہلی پر جو کچھ گذری اس کی موثر داستان انہی خطوط میں ملتی ہے۔ روزنامچہ کے علاوہ جو فارسی میں ہے، غالب نے اپنے اکثر خطوط میں دہلی کی حالت کا ذکر کیا ہے۔ میر مہدی مجروح اور ہرگوپال تفتہ نے دہلی کی حالت کے متعلق ان سے اکثر سوالات کیے اور جوابات ان کے خطوط کے مجموعہ میں درج ہیں، غالب دہلی کی بے رونقی کا ماتم کرتے ہیں اور شرفا اور رئیسوں کی تباہی پر افسوس کرتے ہیں، لیکن یہ سارا ماتم شخصی ہے، اس میں قومی شان نہیں پائی جاتی، غالب دہلی کی بربادی کا ماتم اس لیے نہیں کرتے کہ مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا شہر، ان کے دوست، ان کے سرپرست تباہ و برباد ہو گئے، انھیں قوم پرست یا قومی شاعر کہنے سے پہلے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، اب دیکھیے خود ڈاکٹر صاحب اپنے مقدمہ میں اس کے متعلق کیا لکھتے ہیں، اقتباس ذرا طویل ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے،

"اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے، اور ان کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا، میرے عزیز دوست سید راس مسعود صاحب جو اس وقت اردو علم و ادب کی بہت کچھ خدمت انجام دے رہے ہیں، اور جن کی ادبی دلچسپیوں

کے باعث ان کی اعتراض کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "غالب کی اکثر تحریرات میرے پاس موجود ہیں جن میں انھوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرز حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں"، مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرز حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے، اسی لیے میں نے اس تحریر میں جا بجا خود مرزا کی عبارتیں ان کے مطبوعہ خطوط سے نقل کر دی ہیں، تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتہ چل جائے کہ وہ ان حالات سے کس درجہ متاثر تھے، اور ان کو اپنے ملک کی مٹتی ہوئی عظمت کا کتنا گہرا احساس تھا، یہ سچ ہے کہ ہمارے شعراء کا طرز بیان شعرائے یورپ کے طرز بیان سے بالکل جداگانہ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصوف کے بیان سے ہماری شاعری پُر ہے، لیکن تصوف کے بڑے بڑے مسائل بھی بادہ و ساغر اور گل و بلبل ہی کے الفاظ میں حل کیے گئے ہیں، غالب نے کچھ تو اس زمانہ کے حالات کے اعتبار کے باعث اور کچھ خود اردو شاعری کے خاص طرز بیان کی وجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو پھر یہ تعجب کا کیا مقام ہے، آج بھی جبکہ اردو شاعری کا طرز بیان بہت کچھ بدل چکا ہے، اقبال جیسا شہرۂ آفاق شاعر اپنے جذبات کو بہت کچھ الفاظ میں چھپاتا ہے، غالب کے فارسی دیوان میں بھی جا بجا ان جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔" (مقدمہ از ڈاکٹر محمود۔ دیوان غالب، نظامی اڈیشن طبع سوم ۱۹۳۰ء)

ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار میں حب الوطنی یا وطنیت کا جذبہ محسوس کیا، اس کا نمونہ بھی ملاحظہ کر لیجیے، اشعار مشہور ہی نہیں بلکہ ضرب المثل ہیں،

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

وائے محرومیِ تسلیم و بداحوالِ وفا ۔۔۔ جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۔۔۔ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۔۔۔ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج ۔۔۔ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ۔۔۔ لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ ۔۔۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

سلطنت دست بدست آئی ہے ۔۔۔ جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

لیکن اس قسم کے اشارے دوسرے شعرا کے یہاں بھی ملتے ہیں، مثلاً میر تقی میر کا مشہور شعر ہے

دلی کے گلی کوچے اوراقِ مصور تھے ۔۔۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

یا آتشؔ محبوب کے مکان کی سرزمین کے متعلق کہتے ہیں:

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے ۔۔۔ زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

اس بحث سے قطع نظر، غالبیات میں ڈاکٹر سید محمود کا مقدمہ اپنا مقام رکھتا ہے، بدقسمتی سے غالبیات کے ماہرین نے چونکہ دیوان غالب نظامی بدایونی اڈیشن کی طرف توجہ نہیں کی اس لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ مقدمہ بھی زیادہ مشہور نہ ہو سکا، اور جہاں تک اشعار غالب کے معنی و مطالب کا تعلق ہے، اس میں ہر شارح کو اپنے حسب مطلب و منشا معنی و مفہوم نظر آجاتے ہیں، نظامی بدایونی کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے جہاں جدید مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے دیوان غالب صحت و نفاست کے ساتھ اور اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ اپنے پریس سے شائع کیا وہاں ڈاکٹر سید محمود سے یہ معرکۃ الآرا مقدمہ بھی لکھوا لیا، اور اس کے لیے اردو داں طبقہ

ان کو ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی زیر نظر کتاب بھی ڈاکٹر سید محمود کے سیاسی اور ادبی کارنامے سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی، اور مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ڈاکٹر سید محمود کی جس جوان نگاہ سیاسی بھی نہ کہ ادبی، اس لیے غالب کے متعلق ان کی تمام رایوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا ادبی ذوق نہایت شستہ و پاکیزہ تھا، اور اس کتاب کے فاضل مصنف میر کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ اور ہزاروں محققانہ علمی و ادبی و تنقیدی و تاریخی و فقہی و دینی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے، اس کے مضمون نگاروں میں ندوہ اور عربی تعلیم کے فضلاء کے علاوہ ملک کے بلند پایہ اصحاب قلم و ارباب علم و دانش اور یونیورسٹیوں اور کالجوں کے فضلاء و محققین بھی ہیں، جن کے تحقیقی مضامین، علمی مقالات و ادبی نگارشات سے اس کے صفحات مزین ہیں، یورپ کے مستشرقین نے از راہ عناد اسلام و شارع اسلام و تاریخ اسلام پر جب جب بھی اعتراضات کیے تو سید صاحب اور دار المصنفین کے دوسرے رفقاء نے اسکے صفحات پر ان کے جوابات دیے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

حسب ذیل سالوں کے فائل تو بالکل مکمل ہیں:۔ سنہ ۱۹۳۳، ۱۹۳۵، ۱۹۳۶، ۱۹۳۷، سنہ ۳۸، سنہ ۳۹، سنہ ۴۱، سنہ ۵۱، سنہ ۵۲، سنہ ۵۴، سنہ ۵۵، سنہ ۶۹، سنہ ۷۲، سنہ ۷۳۔

انکی قیمتوں میں کافی رعایت کر دی گئی ہے، ان کے لیے دفتر سے خط و کتابت کریں۔ منیجر

وفیات

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو نامور عالم مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی نے ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی، وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حقیقی بھانجے اور ہم زلف تھے، اُن کی ولادت ۱۳۱۰ھ میں دیوبند میں ہوئی، اُن کے والد شیخ لطیف احمد عثمانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے عزیز تھے، اُن کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، پھر حکیم الامت نے ان کو تھانہ بھون بلالیا، یہاں فارسی کی تکمیل اور عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں، مولانا تھانوی سے بھی مثنوی مولانا روم اور عربی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں، یہاں سے مولانا نے اُن کو مدرسہ جامع العلوم کانپور بھیج دیا، پھر مظاہر العلوم سہارنپور جاکر تعلیم مکمل کی، ۱۳۲۸ھ میں یہیں مدرس مقرر ہوئے، وہ تھانہ بھون میں درس و افتا کی خدمت پر بھی مامور رہے، ۱۳۵۹ھ سے رنگون گئے، جہاں درس و تدریس کے علاوہ وعظ و ارشاد کا بھی مشغلہ جاری رکھا، مولانا ۱۳۶۸ھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے استاذ دینیات مقرر ہوئے، یہاں ایک مدرسہ اشرف العلوم قائم کیا، اس میں بلا معاوضہ درس دیتے تھے، ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم ٹنڈو الہ یار (سندھ) میں شیخ الحدیث ہوئے اور آخر تک اسی سے تعلق رہا،

درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی سلسلہ جاری رکھا، اردو عربی میں بہت سی کتابیں لکھیں، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے گہرے تعلقات تھے، معارف میں بھی ان کے عالمانہ مضامین شائع ہوتے رہے، حکیم الامت کے اکثر مواعظ قلمبند کئے، اُن کی تفسیر بیان القرآن کا تکملہ

کیا، ان کا سب سے اہم کارنامہ بیس جلدوں میں اعلاء السنن کی ترتیب و تالیف ہے، اس میں حنفی مذہب کی مؤید حدیثوں کو بالاستیعاب جمع کرکے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ حنفی مسلک کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں، حواشی میں محدثین اور علمائے فن کی تحقیقات درج ہیں، اس کا مقدمہ مستقل کتاب کی صورت میں علیحدہ ایک جلد میں شائع ہوا ہے، یہ جلدیں حضرت تھانویؒ کی نگرانی میں دیدہ ریزی، وسعتِ نظر اور تحقیق و تنقید سے مرتب کی گئی ہیں، حنفیہ نے جو مسائل قرآن سے مستنبط کئے ہیں ان کو احکام القرآن کے نام سے جمع کرنا شروع کیا تھا، شعبہ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور کی فرمائش پر خود نوشت حالات تواریخ انظر فی آثار الظفر کے نام سے لکھے، شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، اردو عربی دونوں میں دادِ سخن دیتے رہے،

وہ علومِ ظاہر کی طرح علومِ باطن سے بھی مالامال تھے، حضرت مولانا تھانویؒ سے رشتۂ قرابت ہی کا نہیں بلکہ دینی و روحانی تعلق بھی تھا، انکی نماز جنازہ بھی پڑھائی تھی، کئی بار حج و زیارت کعبہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی،

مزاج میں تشدد و انتہاپسندی کے بجائے حق پسندی تھی، ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، جائز اور حق بات کہنے میں جماعتی عصبیت مانع نہ ہوتی تھی، اس کا ثبوت اُن کی معرکۃ الآراء تصنیف اعلاء السنن ہے، ان کے بقول اس میں تقلید جامد کے بجائے تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہے، جس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل کمزور تھی وہاں صاف طور سے ضعفِ دلیل کا اعتراف کیا گیا ہے، اور دوسرے مذاہب کی قوت کو تسلیم کیا گیا ہے،

ان میں علم و سیاست دونوں کا اجتماع تھا، علمی و دینی خدمات کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیتے تھے، تحریک پاکستان کے بڑے حامی تھے اور اس کے لئے ملک کے مختلف مقامات کا دورہ بھی کیا، تحریک کے شباب کے زمانہ میں اعظم گڈھ بھی تشریف لائے تھے، یہاں ان کا بہت بڑا جلوس نکالا گیا تھا جس کی یاد یہاں کے لوگوں میں اب تک باقی ہے، مولانا علم و عمل اور اخلاق و عادات میں علمائے سلف کا نمونہ تھے، ایسے صاحب کمال اور بلند پایہ علما مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ قوم و ملت اور علم و دین کے اس خادم کے درجات بلند کرے، اور اپنے دامن رحمت میں جگہ دے،

"ض"

حکیم محمد اسحاق مرحوم

اعظم گڈھ کے مشہور طبیب حاجی حافظ محمد اسحٰق گذشتہ مہینہ اللہ کو پیارے ہوئے، اُن کی عمر پچاسی ۸۵ سال سے زیادہ تھی، دہلی کے طبیہ کالج میں طب کی تعلیم پائی، حکیم محمد اجمل خاں کے شاگرد تھے، ان کے مطب میں اُن کے نسخے لکھا کرتے تھے دہلی سے آکر اعظم گڈھ میں طبابت شروع کی، اپنے فن میں بڑی مہارت حاصل کرلی تھی، مریضوں کا علاج دل سوزی سے کرتے، علاج اور نسخہ نویسی میں فن کی روایت اور وقار کا پورا لحاظ رکھتے، کسی مریض کو یہ شکایت نہیں ہوئی، کہ ان کی تشخیص غلط تھی، یا اُن کا نسخہ صحیح نہیں تھا شہر کے ہندو مسلمان کے ہر طبقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، شروع سے عمر کے آخر لمحہ تک کانگریسی رہے، ہر زمانہ میں کھدر پہننے کا اہتمام رکھا، ترک موالات، خلافت اور جمعیت العلمار کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے، مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت بھی ہو گئے تھے، دارالمصنفین سے بڑا تعلق لگاؤ رکھا شروع میں یہاں ہفتہ میں تین روز آتے، اُن کی طبی مشغولیت بڑھی تو ہفتہ میں دو روز آنے لگے، آخر میں اپنی کبرسنی کے باوجود ہفتہ میں ایک روز ضرور آتے، اُن کا یہ معمول ساٹھ سال تک رہا، دارالمصنفین کی مسجد میں برسوں تراویح پڑھائی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، اور شاہ معین الدین احمد ندوی کو اُن کے طریقۂ علاج پر کامل اعتماد رہا، بولتے کم تھے، مگر اُن کی زبان سے جو کچھ نکلتا، اس میں وزن وقار اور اخلاص ہوتا، ان کی وفات سے شہر ایک ممتاز طبیب، اور دارالمصنفین ایک بہت ہی مخلص، وضعدار اور کریم النفس قدرداں سے محروم ہوگیا،

اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کرے، آمین،

ض۔ع

......

تعزیتی خطوط

(۳)

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب کی رحلت کے سلسلہ میں تعزیتی خطوط بکثرت موصول ہو رہے ہیں، اُن میں سے کچھ اور یہاں پر درج کئے جاتے ہیں، اس غم میں شریک ہونے والوں کا شکریہ بھی معارف ادا کرتا ہے، (ص۔ع)

خطوط

بمبئی: برادر مکرم محب گرامی زید لطفہ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ۲۰ جنوری کو لکھنؤ سے حجاز کے لئے روانہ ہوا........ آخر فروری تک واپسی ہو سکے گی، آپ نے معارف میں شاہ صاحب پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب ہے، جس نے پڑھا، پسند کیا، آپ کی تحریروں میں آپ کا خاص مقام ہے، اور ہونا بھی چاہئے، کہ شاہ صاحب سے آپ کا تعلق ایسا ہی تھا آپ کا ادبی اور انشائی خوبیاں، زور قلم اور جذبات کا وفور سب اس میں نمایاں ہیں، میں جہاں بھی رہوں گا، دارالمصنفین میں دل لگا رہے گا۔ اور واپسی پر انشاء اللہ جو خدمت ہو سکے گی اس سے دریغ نہ کروں گا، اللہ تعالیٰ ہر طرح آپ کی مدد فرمائے، والسلام آپ کا

(ابوالحسن علی ندوی)

نئی دہلی: مجی! السلام علیکم

مجھے یہ معلوم کرکے بیحد افسوس ہوا کہ شاہ معین الدین احمد صاحب اب ہم میں نہیں رہے شاہ صاحب

اپنے علم و تقویٰ کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی جو خدمت انجام دی، وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی، میں جب کبھی مرحوم سے ملا، ان کی شرافت، متانت، اور سنجیدگی سے متاثر ہوا، جب وہ علی گڑھ تشریف لاتے تھے، تو مجھے اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا، خدا مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے، اُن کی وفات سے آپ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی، دعا ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو دارالمصنفین کی خدمت کا حوصلہ عطا فرمائے، اور گذشتہ کی طرح آئندہ بھی آپ اس ادارہ کے استحکام و ترقی کے لئے کوشاں رہیں،

مخلص یوسف حسین خاں

حیدرآباد: ۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء

مخدومی و محترمی: سلام مسنون

معارف میں حضرت شاہ معین الدین احمد ندوی کے رحلت کی خبر پڑھ کر جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے، ایک عظیم عالم اور ایک عظیم ماہرِ فن ہم سے جدا ہوگیا، (انا للہ وانا الیہ راجعون) اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے،

نیازمند: ہارون خاں شروانی

بمبئی برادرِ مکرم: سلام مسنون

آپ کے تاثرات معارف کے صفحات پر اس طرح اُبھر آئے ہیں، کہ ناممکن ہے کہ دارالمصنفین سے وابستگی رکھنے والے اور معارف کے قارئین اُسے پڑھ کر متاثر نہ ہوں، واقعی شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی ایسی لائق تھی اور ان کا ماتم ان ہی الفاظ میں کیا جانا چاہئے تھا، آپ نے حقِ رفاقت بڑی طرح ادا کیا،

ایک خط میں آپ نے مولانا عبدالسلام قدوائی کے بارے میں لکھا ہے، عجیب اتفاق کہ میرے

ذہن میں بھی پہلا نام یہی آیا تھا، میرا خیال ہے کہ مولانا دارالمصنفین سے قریب ہوجائیں تو بہت اچھا ہو، آجکل کچھ تو حالات اور کچھ پرانی قدروں کے فقدان نے ایسی صورت پیدا کردی ہے کہ اٹھتے جانے والوں کی جگہیں اس طرح پر نہیں ہوسکتی ہیں، جیسا کہ پہلے ممکن تھا، آپ لوگوں کو اس پر سوچنا چاہئے اور کچھ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینا چاہئے،

آپ نے ۲۴ فروری کی تاریخ جلسے کے لئے مقرر کی ہے لیکن ۲۴ سے ۲۷ فروری تک کالی کٹ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہورہی ہے، جس میں شرکت کا بہت پہلے وعدہ کرچکا تھا، اس لئے میرا تو اعظم گڑھ جانا نہ ہوسکے گا، منشی صاحب البتہ جاسکیں گے،

آپ کے سر پر جو بوجھ پڑا ہے، اس کا ہمیں اندازہ ہے لیکن اللہ پر بھروسا رکھیں وہی ان دشواریوں کو آسان کرنے والا ہے،

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا، والسلام۔

شہاب الدین دسنوی

ناظم آباد کراچی۔ مخلصی المحترم سید صاحب! سلام و تحیت مسنونہ،

ایک کارڈ پہلے لکھ چکا ہوں، پرسوں جنوری کا "معارف" ملا، جید و حباب شکریہ، شاہ صاحب کے سانحۂ ارتحال نے دونیم کردیا، ہمہ وقت شاہ صاحب کی معصوم اور دلآویز شخصیت سامنے رہتی ہے، آپ کے شذرات نے آنسوؤں کا سیلاب برپا کردیا، ۱۹۲۳ء میں اعظم گڑھ بحیثیت صدر مدرس شبلی کالج پہنچا تو سیدھا مولانا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سلام کی غرض سے حاضر ہوا، میرے عزیز دوست پروفیسر نیاز احمد صدیقی صاحب اپنے ہمراہ لے گئے، تو وہاں ایک فرشتہ صورت حسین و جمیل، سرخی مائل گورا رنگ، بھاری بھرکم، متوازن داڑھی، بیحد جاذبِ نظر شخصیت سے متعارف ہونے کی سعادت حاصل کی، یہ تھے شاہ معین الدین احمد ندوی کہ دوسری

اعظم گڈھ یوپی کے مشرقی اضلاع میں ایک چھوٹا سا شہر ہے، مگر بحید مردم خیز، علامہ شبلیؒ کے جانشین مولانا سید سلیمان صاحبؒ نے اپنے دارالمصنفین کے قیام سے اعظم گڈھ کو سارے ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں روشناس کر دیا۔ کہنے کو تو شبلی منزل میں دارالمصنفین ایک مختصر سا ادارہ تھا، مگر بہت جلد اُس نے ہندوستان میں ایک امتیازی علمی و ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی، علامہ شبلیؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ۔ اقبال احمد خاں صاحب سہیل مرحوم ایڈوکیٹ، مرزا احسان احمد مرحوم ایڈوکیٹ سب کے سب عبقری و نابغۂ روزگار تھے، مگر سید صاحب نے اعظم گڈھ پہنچکر جس باب کا اضافہ کیا، وہ منفرد صفات کا حامل تھا، سید صاحبؒ نے دارالمصنفین کو جس اوجِ کمال تک پہنچایا، اس کے اعتراف میں بخل کرنا یقیناً بے بہرہ ہونے کی دلیل ہے، سید صاحب ناگزیر حالات سے متاثر ہو کر بھوپال، پھر پاکستان آ گئے، تو دارالمصنفین کی طرف سے فکر دامنگیر ہوئی، لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ سید صاحب کے تربیت یافتہ سید صباح الدین عبدالرحمن اور شاہ معین الدین ندوی نے جنھیں اب مرحوم کہتے ہوئے دل و دماغ جواب دینے لگتے ہیں، کس عمدگی سے اُن کے کام کو سنبھال لیا، دونوں نے بے مثال ایثار، محنت اور اخلاص سے اس ادارہ کی شہرت کو نہ صرف قائم رکھا، بلکہ اس میں چار چاند لگا دیئے۔

شاہ صاحب حضرت شیخ عبدالحق نور اللہ مرقدہٗ کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، اُس خاندان کی خصوصیت سے مالا مال تھے، پیرزادہ بلکہ شہزادے تھے، متین و سنجیدہ، اولوالعزم شگفتہ، دوستوں سے بے تکلف، بغیر تصنع کے فرق مراتب کا لحاظ کرنے والے، ادیب باتمیز، نابغۂ روزگار، شہرت سے بے نیاز، مجسم انکسار، سراپا اخلاص، نفاست پسند، غرضیکہ تمام انسانی صفات سے آراستہ۔ کیا لکھوں کہ کن کن خوبیوں سے اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو نوازا تھا،

میری اور اُن کی رفاقت تقریباً اٹھارہ سال رہی، اور شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو کہ ہم سب شام کی صحبت سے خوش وقت نہ ہوئے ہوں، اور رات کا کھانا ساتھ نہ کھایا ہو، اس طویل مدت میں کبھی ایک لمحہ بھی ایسا نہ آیا کہ ہم دونوں کسی مسئلہ میں اختلافِ رائے بھی کرتے، یہ اُن کے اخلاق کی بلندی کی دلیل ہے،

دنیا کے کام بُرے بھلے چلتے رہیں گے، مگر شاہ صاحب اب اس دنیا میں نہ مل سکیں گے، آپ نے جن تاثرات کی اپنے شذرات میں نشان دہی کی ہے، میں سمجھتا ہوں آپ اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں، جس کے اظہار کے لئے آپ میں مزید تاب و طاقت نہیں رہی، میں آپ کے اس کرب کو محسوس کرتا ہوں، کاش میں آپ کے پاس ہوتا، اور ہم دونوں رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال لیتے،

فی الوقت تو بس گریہ گلو ہوں لیکن اس سے نہ آپ کو تسکین ہو سکتی ہے، اور نہ مجھ کو، بس دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ آپ کی سب طرح مدد کرے، اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت کی نعمتوں سے بہرہ ور فرمائے، آمین!!

برادرانِ حال سے سلام مسنون کہیئے گا، والسلام

اخلاص کیش آپ کا بشیر، ۲۸ فروری ۷۵ء

کراچی ۱۷ دسمبر ۷۴ء

برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ خط ایک نہایت اندوہناک حادثہ کی خبر سُن کر لکھ رہا ہوں، آل انڈیا ریڈیو کے حوالہ سے یہاں کے اخبار میں شائع ہوا ہے کہ ۱۳ دسمبر ۷۴ء کو شاہ معین الدین احمد صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا، اس خبر سے جتنا صدمہ ہوا بیان نہیں کر سکتا، آپ کا رنج و غم تو

مجھ سے کہیں زیادہ ہوگا، میں تو صرف ۹ سال مرحوم کے ساتھ رہا، آپ تو چالیس سال سے اُن کے رفیق رہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے، اور آپ کو صبرِ جمیل کی توفیق دے، کیا بتاؤں یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، کہ شاہ صاحب نہیں رہے، اُن کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے، اب آپ اپنے کو تنہا محسوس کرتے ہوں گے، خداوند کریم آپ کی مدد فرمائے،

(۲)

کل معارف موصول ہوا شاہ صاحب مرحوم پر آپ کے شذرات پڑھ کر وہ صدمہ پھر تازہ ہوگیا، آپ نے مرحوم کا تذکرہ ایسے جامع اور موثر انداز میں کیا ہے کہ اُن کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آگئی، اللہ تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس عطا فرمائے، اور آپ کو اس صدمہ کی برداشت کی طاقت بخشے، اب اُن کی جانشینی بھی آپ ہی کو کرنی ہوگی، اس دُہرے بار کو سنبھالنے میں خداوند کریم آپ کی مدد فرمائے، میں نے مرحوم کے انتقال کی خبر سُن کر ۱ر دسمبر کو ایک خط لکھا تھا، وہ خط آپ کو ملا کہ نہیں،

خاکسار محمد عزیر

جامعہ نگر، نئی دہلی (۹ر فروری ۷۵ء)

محترمی، سلام ورحمت

۱۴ر دسمبر کی صبح کو میں جرمنی کے لئے روانہ ہوا، اور وہاں سے حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا اب واپس ہوا ہوں،

یہاں آکر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی اندوہناک خبر سُنی، کیا عرض کروں تھوڑی دیر کے لئے طبیعت پر کیا کچھ نہیں گذر گئی، میں کیسے اپنے رنج وغم کا اظہار کروں، کئی

دن ہوگئے، شاہ صاحب کا مسکراتا پُر نور چہرہ نگاہوں کے سامنے پھر پھر جاتا ہے، اور اُن کے کمالات ذاتی ومعانی کی یاد تازہ کر جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے اُن کے مراتب بلند فرمائیں، آمین،

ابھی ہمیں نہ معلوم کتنوں کا ماتم کرنا اور سوگ منانا ہے، لیکن ان سب میں شاہ صاحب کی شخصیت ایسی نمایاں تھی کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سانچہ ہی اب نایاب ہے جس میں وہ ڈھلی تھی، شاہ صاحب کو دیکھتا تو جی چاہتا کہ دیکھا کروں، کیسی جاذبیت تھی اُن کے ہر انداز میں کیسی کشش تھی اُن کی ہر ادا میں،

مرحوم کے علمی وادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا جائے گا، انھوں نے اپنی نگارشات سے جس طرح شبلی وسلیمان کی روایت کو زندہ اور دارالمصنفین کی عظمت کو قائم رکھا، وہ ہمارے علم وادب کی تاریخ کا ایک روشن باب بن گیا ہے،

احساسات وجذبات کے اس ہجوم میں آپ کی یاد مسلسل آرہی ہے، آپ اور ان کا کوئی چالیس برس کا ساتھ تھا، اتنی طویل رفاقت اور ایسی محبت، ایسا تعلق خاطر، یہ خود اپنی جگہ ایک روایت بن گئی ہے، اب جو ہر طرف افراتفری ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گذرے گا کہ لوگ اس رفاقت کو جو بے لوث تھی، بے غرض تھی، اور ایک نصب العین کی خاطر، بے سروسامانی اور نا آسودگی میں تھی، مثال دیں گے،

اس سانحۂ عظیم سے آپ پر جو گذری اور گذر رہی ہوگی، اس کا کچھ کچھ اندازہ کر سکتا ہوں معارف میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب ہی نہیں، بلکہ عظیم ہے، اور اس سے آپ کے اس رنج واندوہ کی کسی قدر ترجمانی ہو جاتی ہے، جو آپ کے دل پر گذر رہا ہے، یہ رنج وہ رنج نہیں کہ تراوش قلم سے ہلکا ہو جائے، اس کی تلخی بڑھتی ہی رہتی ہے، اور زندگی کا جزو بن جاتی ہے لیکن صبر جمیل اور مشیت ایزدی پر رضا برضا رہنے کی توفیق رنج کی اس تلخی کو کسی اور

نشے میں بدل دیتی ہے، اور یہ غم ایک مرحلے میں سرمایۂ حیات بن جاتا ہے، مجھ جیسا کہ میں آپکے
حسن طبیعت کا کسی قدر شناسا ہوں، امید ہے کہ آپ اس سرمایۂ حیات سے محروم نہیں رہیں گے،

جی چاہتا ہے کہ جلد آپ سے ملاقات ہو، دیکھیں کب اور کہاں یہ ملاقات ہوتی ہے، معارف
کا جنوری کا شمارہ مجھے نہیں ملا، میں نے جامعہ لائبریری میں اُسے دیکھا، میری عدم موجودگی میں ایک پیکٹ گھر پر ضائع ہو گیا، براہ کرم
اُسے بھجوا دیجئے۔ ممنون ہوں گا اگر جامعہ میں تبصرہ کے بہانے حیات سلیمان کی ایک کاپی بھجوا دیا تو
پڑھ بھی لوں گا، اور تبصرہ بھی ہو جائے گا،

میں ایک گنہگار بندہ ہوں، پھر بھی آپ کی طمانیت قلب کے لئے دعاگو ہوں، اللہ تعالیٰ
آپ کو صبر جمیل عطا فرمائیں، دارالمصنفین کے تمام کارکنوں کو، خاص طور سے اس مالی کو جس کا مجھے
نام نہیں یاد آ رہا ہے، سلام عرض ہے، اور یہ بھی کہ میں بھی اُن کے غم میں شریک ہوں،

انشاءاللہ دارالمصنفین زندہ اور اُس کی علمی روایات پائندہ رہیں گی،

آپ کا مخلص ضیاء الحسن فاروقی

باسمہ تعالیٰ۔ از جامعہ نگر ۔ نئی دہلی

مخلص مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج سامی بخیر۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر اخبارات
میں پڑھ چکے ہیں، اپنے قلب حزیں کے تاثرات، اخبار الجمعیۃ کے ذریعہ پیش کر دیئے تھے، مگر افسوس
ہے کہ بعض سخت خانگی مصروفیات کے سبب آپ کو اب تک تعزیتی خط نہ لکھ سکا،

بلاشبہ یہ حادثہ علمی و دینی دنیا کا المناک حادثہ ہے، شاہ صاحب کی ذات قدیم و
جدید اہلِ علم کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں
ملت کا درد اور قلم میں طاقت دی تھی، ملی و دینی مسائل میں وہ بے باکانہ اپنی رائے کا اظہار

اس انداز سے کرتے تھے، کہ مخالف بھی اس کے وزن کو محسوس کرتے تھے، حضرت سید صاحب
کے بعد انھوں نے معارف کے معیار کو بڑی خوبی سے قائم رکھا،

ندوۃ العلماء کی کمیٹیوں میں اُن سے ملاقات ہوتی تھی، اور اُن کی محبت عنایت اور
اخلاص و کرم سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا، گزشتہ سال حج کو جاتے ہوئے وہ جامعہ
میں اپنے دوست اور ہم وطن، جناب مولوی ارشاد الحق مرحوم کے ساتھ ٹھہرے تھے، تو آخری
ملاقات کا موقع ملا تھا، احباب اور نیازمندوں کا ایک جم غفیر اُن کے گرد جمع تھا، افسوس نہ
مہمان رہے، نہ میزبان، ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

آپ کا اور اُن کا ہر وقت کا ساتھ تھا، وہ آپ کے رفیق بھی تھے، اور بزرگ بھی، میری
طرف سے اس حادثہ میں دلی تعزیت قبول فرمائیں،

اللہ تعالیٰ آپ صاحبان کو صبر و اجر سے نوازے، اور اُن مرحوم کو اپنی آغوش رحمت
میں جگہ عطا فرمائے، والسّلام

نیازمند (قاضی) زین العابدین
ناظمِ دینیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی،

۲۰ر جنوری ۱۹۷۵ء

درگاہ شریف رودولی ضلع بارہ بنکی، ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۴ء

میرے کرم فرما، سلام علیک اور بہت سی دعائیں،

اللہ تعالیٰ دین و دنیا دونوں سنوارے،

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں آپ سے تعزیت کروں، ان کی اچانک جدائی

سے دل کی ساری چولیں ہل گئی ہیں،

آپ کے دل کی کیفیت کا خوب اندازہ کر رہا ہوں۔ مگر سوا صبر کے چارہ ہی کیا ہے،

ع : ایک ہی غم گسار تھا نہ رہا،

بگیتی گر کسے پاینده بودے

ابوالقاسم محمدؐ زنده بودے

مجھ گنہگار کے خاتمہ بالخیر ہونے کی دعائیں کرتے رہیے، (خدا حافظ)

آپ کا قدیم دعاگو و نیازمند،

فقیر حقیر۔ آفاق احمد عفی عنہ،

کوتنگ سول لائن۔ علی گڑھ - ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۴ء

برادرم صباح الدین صاحب، سلام مسنون،

کن الفاظ میں شاہ صاحب کے بارہ میں آپ کو تعزیتی خط لکھوں اور کیسے ان کے لئے مرحوم کا لفظ استعمال کروں، قومی آواز نظر سے گذرا تو اس سانحۂ جانکاہ کی خبر ہوئی، ہائے ہائے آپ کو تسکین دینے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں، آپ پر جو گذری ہے اس کا حال بھی اخبار میں پڑھا، یہ سچ ہے کہ شاہ صاحب کی موت ایک المیہ ہے، دار المصنفین کے لئے، علم و ادب کے لئے، شرافت و مروت کے لئے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صداقت ہے کہ یہ سب سے بڑا المیہ آپ کی زندگی کا بھی ہے، اُن کی موت سے آپ کی اور ڈاکٹر عبد الحفیظ انصاری صاحب کی زندگی کا بھی خلا پُر نہ ہوگا، شبلی منزل کے لئے آپ و شاہ صاحب دونوں لازم و ملزوم تھے، یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں کر سکتے کہ دو دماغ میں کون اصلی دماغ تھا، ابھی تو سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کیسے صبر آئے گا، اللہ آپ کس طرح اس صدمۂ عظیم کو برداشت کر سکیں گے، یہ سانحہ کیسا اچانک اور

یکایک پیش آیا، بیمار ہوتے، صاحب فراش ہوتے تو ذہن آہستہ آہستہ اس سانحہ کے لئے تیار ہوجاتا، غم تو اس وقت بھی ہوتا، مگر اس میں یہ شدت نہ ہوتی، آج جب کہ شاہ صاحب ہمارے بیچ میں نہیں ہیں، اُن کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، ۱۹۴۹ء کی پہلی ملاقات سے لے کر ۱۹۷۲ء کی آخری ملاقات سے متعلق ایک ایک یاد ذہن پر مرتسم ہے، وہ کیسے بھلائے جاسکیں گے، خدا اُن کی مغفرت کرے، مگر اُن کے لئے دعاے مغفرت تو رسمی بات ہوئی، اُن کی زندگی کتنی پاک اور صاف تھی، اُن کی مغفرت نہ ہوگی تو کس کی ہوگی؟

مخلص : خلیل الرب

اخی الکریم فضیلۃ الشیخ عبد السلام الندوی السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

آپکے والا نامہ سے اخی الاکبر فضیلۃ الشیخ شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات کی اطلاع ملی،

اس خبر نے مجھے بہت غمگین اور بے چین کردیا، انا للہ وانا الیہ راجعون،

اللہ اُن کو اپنی رحمت سے نوازے، اور اپنی وسیع جنت میں انھیں جگہ عطا فرمائے وہ بڑا سننے والا اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے،

اخی العزیز! اُن کی وفات پر میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائیے، اور اُن کے عزیزوں، خاندان والوں، تمام دوستوں، بھائیوں، رفیقوں، اور رشتہ داروں کو فرداً فرداً میری تعزیت پہنچا دیجئے،

اللہ تعالیٰ اُن کے بعد اس ذمہ داری کے اٹھانے میں آپ لوگوں کی مدد فرمائے، جس کا بار اب تک وہ اٹھائے ہوئے تھے، اور توفیق بخشے کہ علم اور طالبین علم کی خدمت میں لگے رہیں، اور اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے ہدایت بخش اصول کی ترویج میں اپنی زندگی اسی طرح صرف کرتے رہیں، اللہ آپ کی اعانت فرمائے،

راشد عبد اللہ البرولیسی، وزارت اعلام (انفارمیشن) مدینہ منورہ ۲۷ر جنوری ۱۹۷۵ء

بمبئی، ۲۵ر دسمبر ۷۴ء

مکرمی صباح الدین صاحب! السلام علیکم،

ادھر کچھ دنوں سے لغت کی ترتیب کے سلسلہ میں بمبئی آگیا ہوں، اور انجمن اسلام میں مقیم ہوں، شاہ صاحبؒ کے انتقال کی خبر سے بہت صدمہ ہوا، دہلی میں ندوہ کے طلبائے قدیم کے تعزیتی اجتماع میں شریک تھا، اس زمانہ میں بعض کاموں کی وجہ سے دہلی جانا ہوا تھا، شاہ صاحب سے ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں میرا بڑا قریبی تعلق تھا، آج اُن کی پُرخلوص محبت اور دوستانہ عنایت یاد آتی ہے، تو دل تڑپ جاتا ہے، ابھی حسین حسان کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ یہ دوسرا صدمہ برداشت کرنا پڑا، شاہ صاحبؒ نے علم و دین کی خدمت میں ساری زندگی صرف کردی، اُن کی خوش بختی پر رشک آتا ہے، اللہ اُن کے مراتب بلند فرمائے، اور آپ لوگوں کو ایسی ہمت عطا فرمائے، کہ آپ اُن کے کاموں کو آگے بڑھائیں، فقط

حفیظ الدین ندوی

مراد آباد - ۱۵ر فروری

محترم و مکرم بندہ! السلام علیکم،

مزاج گرامی - کرم نامہ ملا، جزاکم اللہ! حضرت شاہ صاحبؒ کا واقعی جتنا غم و فکر آپ کو ہوگا، وہ تھوڑا ہے، حق تعالیٰ شانہ غیب سے دستگیری فرمائیں، شاہ صاحب کے لئے دعاء ایصال اور آپ کے لئے قوت و ہمت اور دار المصنفین کے لئے غیب سے کفالت اور اس کے انتظام کی دعائیں مانگ رہا ہوں، مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ہی اس وقت سب سے بزرگ ہیں، حق تعالیٰ اُن کو ذریعہ بنائیں، تشریف لے آئے ہوں تو میرا سلام فرما دیجئے گا، بندہ نے شاہ صاحب سے کبھی عرض کیا تھا کہ دار المصنفین کی مطبوعات کا علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہونا بہت ضروری ہے، اس کے ذریعہ نئے مارکٹ بھی حاصل ہو جائیں گے،

اور مقصد ادارہ بھی پورا ہوگا، اگر بمبئی کی طرح اجلاس کلکتہ اور مدراس میں کئے جائیں، اور اسی کا مقصد یہ قرار دیا جائے، کہ وہاں اُن کے تراجم و اشاعت کی شاخیں قائم ہوں، کم از کم تامل، تلگو، بنگلہ، گجراتی، مرہٹی زبانوں کو لیا جائے، اب آپ کی شوریٰ تو ہوگی، اسی میں اس مسئلہ کو رکھیں، سُنّی سنٹرل اوقاف، صوبائی اوقاف اور نظام ٹرسٹ سے بھی اس میں امداد حاصل کرنے کی ضرورت ہے، دعوتی مقصد کے تحت کچھ مضامین معارف میں آتے رہیں، جیسے بعض شاہ صاحب نے تحریر فرمائے تھے، شاہ صاحب کا دسمبر میں کچھ نہ تھا، اکتوبر یا نومبر ۷۴ء میں شاہ صاحب کا کوئی مضمون و شذرات ہوں، تو ضرور بھجوا دیجئے، بڑا کرم ہوگا، اُن کی آخری تحریریں دیکھنے کو بڑا جی چاہتا ہے، شاہ صاحب کے میرے پاس ۸۴ خطوط ہیں، اگر آپ فرمائیں تو انہیں ارسال کر دوں، مولانا علی میاں صاحب نے تحریر فرمایا تھا، کہ تعمیر حیات شاہ صاحب پر نمبر نکال رہا ہے، کچھ خط اس میں دیدیئے جائیں، اسحاق جلیس کو بھی میں نے لکھا ہے، اگر آپ طلب فرمائیں گے تو مقدم دار المصنفین ہے، ورنہ ندوہ روانہ کر دوں گا، آپ کے جواب کا انتظار رہے گا، شاہ صاحب پر آپ کا مضمون رُلا دینے والا ہے، اس میں حضرت سید صاحبؒ کے مزار کی حاضری والے مضمون کی جھلک ہے، جزاکم اللہ،

شاہ صاحب کے سلسلے میں اور کیا تجاویز ہیں، معارف کا ایک نمبر تو اُن پر نکلنا ہی چاہئے، اپنے اور شاہ صاحب کے تعلق پر کچھ لکھ کر تعمیر حیات لکھنو کو بھیجا ہے، المجیب پھلواری شریف سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے کوئی مضمون افغانستان میں اسلام کی دعوت کے کام پر تحریر فرمایا تھا، اگر مل سکے تو بڑا کرم ہوگا آپ کی صحت اب کیسی ہے، والسلام

خادم

افتخار فریدی

انجمن اسلام بمبئی، ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۴ء

برادرم سلام مسنون

آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیسے لکھوں، مرحوم کی معصوم سی صورت رہ رہ کر سامنے آتی ہے، اور دل بھر آتا ہے، آپ پر جو کچھ گذر رہی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا میرے لئے مشکل نہیں ہے، مرحوم کی دائمی جدائی کے ساتھ ساتھ آپ کی تنہائی، بلکہ بے کسی کا خیال کچھ کم صدمہ کا باعث نہیں ہے، دارالمصنفین یتیم ہوگیا، اب اسے تن تنہا آپ ہی کو سنبھالنا اور زندہ رکھنا ہوگا، اللہ آپ کو صبر دے، آپ کے لئے بڑا سانحہ ہے، سید صاحبؒ کی وفات کے بعد سب سے بڑا سانحہ، آپ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے ہیں، میں آپ کو کیا سمجھاؤں، صبر اور ہمت سے کام لیجئے، اللہ آپ کی ہر لحاظ سے مدد فرمائے، والسلام، آپکے غم میں شریک، عبدالرزاق قریشی،

حیدرآباد، ۲۰؍دسمبر ۱۹۷۴ء

رفیق محترم دام مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

دعوت اخبار دہلی میں مولانا شاہ معین الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارتحال کی خبر سے بہت رنج و ملال ہوا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم و فیضان رحمت سے سرفراز کرے، آپ کو معلوم ہے کہ میں ۴؍نومبر ۱۹۷۴ء کو حاضر ہوا تھا، شاہ صاحب مرحوم نے بہت ہی خاطر تواضع کی، ۵؍نومبر کو آپ لوگوں سے رخصت ہوا، اس وقت شاہ صاحب بہت اچھے تھے، مجھ سے فرمایا کہ میں جلد مکان جاؤں گا، اور نومبر گذار کر دسمبر میں دارالمصنفین واپس ہونگا، غالباً مرحوم وطن جاکر علیل ہوئے، اور جلد آغوش رحمت باری تعالیٰ میں پہنچ گئے، اب دارالمصنفین میں آپ تنہا ہیں، تمام کام کا بار آپ پر پڑ گیا، معارف کی اشاعت کتابوں کی تالیف و تصنیف اور طباعت، الغرض دارالمصنفین جیسے بڑے ادارہ کا چلانا آپکے ذمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ آپ کو قوت و طاقت و عافیت عطا فرمائے،

والسلام محمد طٰہٰ ندوی، (باقی)

مطبوعات جدیدہ

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۲۴، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت:۔ ۳۰ر

پتہ: انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش، اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد۔

حضرت شاہ امین الدین علی اعلیٰ دسویں صدی ہجری میں عادل شاہی دور میں سلطنت بیجاپور (دکھن) کے صاحب سلوک و ارشاد بزرگ تھے، سلوک و تصوف میں ان کے کمالات کے ساتھ دکھنی زبان و ادب میں ان کی خدمات بھی کم اہم نہیں ہیں، زیر نظر کتاب میں لائق مصنف کے پی، ایچ، ڈی کے مقالہ کے ایک حصہ کے علاوہ شاہ امین کے حالات زندگی اور ادبی و لسانی خدمات کی تفصیل ہے، یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں بطور پس منظر بیجاپور میں مسلمانوں کی آمد، عادلشاہی حکومت کے قیام اور حضرت شاہ امین کے عہد کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی حالات اختصار سے تحریر کئے گئے ہیں، دوسرے حصہ میں شاہ صاحبؒ کے خاندانی حالات، پیدائش و وفات کے سنین کی تحقیق اور خلفاء و مریدین کا ذکر ہے، اس میں حضرت امین کے والد شاہ برہان الدین جانم اور دادا میران جی شمس العشاق کا مفصل ذکر ہے، تیسرے باب میں حضرت امین اور انکے خانوادہ کے طریقۂ رشد و ہدایت کا جائزہ ہے، اس میں تصوف کی بعض اصطلاحات کی نئی تعبیرات بھی ہیں، چوتھے باب میں شاہ امین کی منظوم اور نثری تصنیفات کے علاوہ ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جو غلطی سے ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں، یا جن کا ان کی جانب انتساب شک و شبہہ

خالی نہیں ہے، اس ضمن میں ہر تصنیف سے متعلق مفید معلومات بھی دیے گئے ہیں، اور مختلف کتبخانوں میں انکے مخطوطات کی نشان دہی کی گئی ہے، آخری باب میں حضرت امین کی زبان پر تبصرہ ہے، اور اس پر گجری کے اثرات، اس کی صرف و نحو، روزمرے، محاورے اور اصطلاحات وغیرہ کا ذکر ہے، اس کتاب میں کہیں کہیں بیجا طوالت اور غیر ضروری تفصیل سے کام لیا گیا ہے، حضرت شاہ امین کے نام اور بعض دوسرے مباحث کو اس قدر پھیلا دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اکتاہٹ ہونے لگتی ہے اور نفس مسئلہ میں الجھاؤ بھی پیدا ہو گیا ہے، مصنف کو خود اعتراف ہے کہ شاہ امین پر بہت کم لکھا گیا ہے اسی لیے ان کے حالات و کمالات کے بعض واقعات جو اس کتاب میں دیے گئے ہیں، مشکوک معلوم ہوتے ہیں، تاہم یہ بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے، اور اس سے حضرت امین کی دکھنی زبان و ادب اور اردو کی ابتدائی خدمات میں ان کے خانوادے کی مساعی سامنے آجاتی ہیں۔

جب ایمان کی بہار آئی۔ مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تقطیع متوسط، کاغذ کتابت اعلیٰ صفحات ۲۰۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت عـ۸/ پتہ: مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ

معارف میں اس کے عربی ایڈیشن "اذا ہبت ریح الایمان" پر ریویو کیا جا چکا ہے، اب مصنف کے ایما سے ان کے برادر زادہ مولوی سید محمد الحسنی نے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے، لائق مترجم نے فاضل مصنف کی مشہور و مقبول اردو تصنیف "سیرت سید احمد شہید" کو سامنے رکھکر یہ ترجمہ کیا ہے، اسلیے بقول مصنف "بہت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیا ہے"۔ اصل کتاب میں سید صاحب کی ایمانی استقامت، عقائد میں پختگی، مجاہدانہ کردار، اور انکے رفقاء کی دینی و ایمانی حرارت کو نہایت دلکش اور پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، شروع میں نامور مصنف کے بھانجے مولوی محمد ثانی مرحوم جنھوں نے بطور پس منظر سید صاحب کا سوانحی خاکہ مرتب کیا ہے، ابتدا میں ادب و انشاء کے ماہر

مصنف کے پرسوز قلم سے ایک ولولہ انگیز مقدمہ بھی ہے، اس کتاب سے نہ صرف سید صاحب اور ان کی جماعت کی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے، بلکہ اس سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی بھی پیدا ہوتی ہے،

تجدید دین انسانی۔ از جناب صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری تقطیع خورد، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۲۰ قیمت ع۲/ پتے: (۱) اسلامک اسٹڈیز سرکل اوقاف بلڈنگ، بڈشاہ چوک سرینگر کشمیر (۲) مکتبہ مسلم، بربرشاہ، سرینگر۔

صوفی نذیر احمد صاحب ملک و ملت کی اصلاح اور نوع انسانی کی خیر خواہی کا مخلصانہ جذبہ رکھتے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں قوم و وطن کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے اور دنیا کے اضطراب و انتشار کو دور کرنے کی تڑپ پائی جاتی ہے، اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ اسلام ساری کائنات کا دین و آئین ہے، تمام انبیاء نے اسی کی دعوت دی تھی، اور نبی آخر الزماں نے بھی اسی کی تجدید و تکمیل فرمائی ہے، اس لیے یہی وہ عالمگیر اور دائمی مذہب ہے جو دنیا کو موجودہ خلفشار اور بے چینی سے نکال کر امن و سکون کا گہوارہ بنا سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں برہمن ازم ذات پات پر مبنی ایسا فسطائی نظام ہے جو اخلاقی، روحانی اور معاشرتی انتشار کو جنم دیتا ہے، انھوں نے ملوکیت اور موجودہ اشتراکی اور جمہوری نظاموں کے نقائص اور تباہ کن اثرات بھی دکھائے ہیں، اور اسلام کے پانچوں بنیادی ارکان توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی حقیقت بیان کرکے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام ہی در اصل اخوت و مساوات، انسانیت کی شیرازہ بندی اور فلاح و ترقی کا اصل ضامن ہے، ان ارکان کے بارہ میں موجودہ مسلمانوں کی کجروی اور بے اعتدالی کی نشاندہی بھی کی گئی ہے لیکن صوفی صاحب کی تحریروں میں ظاہری دلکشی کی کمی ہوتی ہے اور بعض خیالات بہت واضح بھی نہیں ہوتے، کہیں کہیں غیر متعلق مباحث اور غیر ضروری طوالت میں بھی پڑ جاتے ہیں، اس سے قطع نظر جو کچھ لکھتے ہیں اس میں دلسوزی

اور اخلاص کے علاوہ غور و فکر کا عنصر شامل ہوتا ہے، یہ کتاب بھی اسی جذبہ سے لکھی گئی اور بڑی مفید اور کارآمد باتوں پر مشتمل ہے۔

شب جائے کہ من بودم۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۱۲ مجلد مع گردپوش، قیمت [illegible]۔ پتہ: مطبوعات چٹان میکلوڈ روڈ، لاہور۔

پاکستان سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے وہاں کے ممتاز مصنف، مشہور شاعر، نامور صحافی اور دار المصنفین کے بڑے قدردان جناب شورش کاشمیری نے اپنی کتابوں کا سٹ ۱۱ - خفتہ دار چٹان ارسال کیا، معارف میں تبصرہ کے لیے پہلے انکی کتابوں میں سے اس کتاب کا انتخاب کیا جا رہا ہے جسمیں انکے مقدس سفر حج کی روداد ہے۔

شورش صاحب نے ۱۹۶۹ء میں ہوائی جہاز سے حج کا سفر کیا، چودہ دنوں تک انکو بیت اللہ، بارگاہ رسالت اور ارض قرآن میں باریابی کی سعادت میسر آئی، ان کا دل خدا کی عظمت، اسلام کی محبت، رسول کی عقیدت اور قوم و ملت کے درد سے سرشار اور طبیعت بڑی حساس اور بیچین ہے، اسلیے حرمین اور مقدس مقامات میں حاضری کے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی، جسکی پوری تصویر اس کتاب میں ملتی ہے، ہر مقام پر انکو قرن اول کے واقعات یاد آئے ہیں جنکو پر اثر انداز میں لکھکر عربوں اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا بھی جائزہ لیا ہے، انکو مکہ میں کھجور اور زمزم اور جدہ میں زبان و اذان کے علاوہ ہر طرف یورپ کا مال نظر آیا، وہ یہودیوں کے قبلہ اول کے لے اڑنے اور نصاریٰ کے ہاتھوں شمع گل ہو چکنے اور عربوں کے طیش کے ختم ہو جانے اور عیش میں مبتلا ہو جانے کا ذکر کر کے بھی اشکبار ہوئے ہیں، آل سعود کے قبروں اور مقدس مقامات کے بارہ میں رویے کا بڑے سخت لہجہ میں ذکر ہے، مگر یہ شکوہ شورش صاحب کی فرط عقیدت کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے، بعض اوقات شریعت کے معاملات عقیدت و محبت کے جذبات کی تہ کے نیچے دبکر رہجاتے ہیں، (ص ۶۵) پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غار حرا میں مسلسل ۴۰ سال تک تشریف لیجانے اور عبادت کرنے کا ذکر ہے، حالانکہ آپ نے ۴۰ سال کی عمر میں وہاں جا کر عبادت کرنا شروع کیا تھا، یہ کتاب شورش صاحب کے مخصوص انشا پردازانہ انداز بیان کا نمونہ ہے، اسکے مطالعہ سے [illegible] کی طرح ناظرین بھی اپنے کو کیفیات اور جذبات سے مخمور اور سرشار پائیں گے، اتنا کے نام میں بھی [illegible] دل آویزی [illegible]، شروع میں مقدس مقامات کی تصویریں دی گئی ہیں۔

جلد ۱۱۵ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء مطابق ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۹۵ھ عدد ۴

مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمن	۲۴۲-۲۴۴

مقالات

مضمون	مصنف	صفحات
ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	" "	۲۴۵-۲۶۸
اراضی ہند کی شرعی حیثیت	جناب نور الحسن صاحب راشد (کاندھلوی)	۲۶۹-۲۹۲
(چند قدیم تحریریں) جامع مسجد برہان پور کے کتبات (نقش اسیر گڈھ کا کتبہ)	جناب مولوی معین الدین صاحب استاذ اردو و فارسی سیوا سدن کالج (برہان پور)	۲۹۳-۳۰۴
قرص (سائیرس)	محمد اقبال ندوی ناظر کتبخانہ دار المصنفین،	۳۰۵

ادبیات

مضمون	مصنف	صفحات
یاد اقبال	جناب پروفیسر سید حسن صاحب سہرسہ پٹنہ	۳۱۴-۳۱۵
غزل	جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری	۳۱۵
مطبوعات جدیدہ	" ض "	۳۱۶-۳۲۰